معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۸ ماہ جمادی الاخری ورجب المرجب ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۶ء عدد ۵

فہرست مضامین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شذرات

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نومبر کے اوائل ہی سے مرحلہ وار کھلنا شروع ہو گئی ہے، یہ رسالہ جس وقت قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ انشاء اللہ اس وقت تک اس کے سارے شعبے اور دفاتر کھل چکے ہوں گے۔ خدا اسے آئندہ بحران و تعطل سے محفوظ رکھے۔ اب یونیورسٹی سے وابستہ تمام لوگوں کو یہ عزم مصمم کرنا ہوگا کہ وہ اپنا نقصان تو برداشت کرلیں گے مگر ہندوستانی مسلمانوں کے اس سب سے قیمتی سرمایے پر کوئی آنچ نہ آنے دیں گے اور نہ اپنے معمولی فائدوں کے لئے طلبہ کو آلہ کار بناکر یونیورسٹی کی ذلت و رسوائی کا سامان کریں گے۔ طلبہ کو بھی اس کا تہیہ کرنا ہوگا کہ آئندہ وہ اندرونی اور بیرونی سازشوں کا شکار ہوکر ایسے اقدامات نہ کریں گے جس میں بالآخر انہی کا نقصان ہوتا ہے، اپنی شکایتوں کے ازالہ اور مطالبات کو پورا کرانے کے لئے تشدد، ہنگامے اور توڑ پھوڑ کے طریقے اختیار کرکے یونیورسٹی کی املاک کو برباد نہ کریں گے۔ منتظمین اور ذمہ داروں کو حالات سے پوری طرح باخبر رہنا ہوگا تاکہ کوئی ناگوار صورت پیدا ہی نہ ہو اور اگر اتفاقاً پیدا بھی ہو جائے تو وہ لاعلاج اور قابو سے باہر نہ ہو۔ سارے عناصر مل جل کر اخلاص اور نیک نیتی سے یونیورسٹی کے حالات کو بہتر بنانے اور اعتدال پر لانے کی کوشش کریں گے تب ہی ہمارا کارواں جادہ پیما ہو سکتا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ اکتوبر میں یونیورسٹی میں جو کچھ ہوا بہت افسوس ناک اور شرم ناک ہے لیکن اگر آگے بڑھنا ہے اور حالات کو معمول اور اعتدال پر لانا ہے تو پچھلی یادوں اور تلخیوں کو بھلانا ہوگا، گذشتہ غلطیوں کو دہرانے کے بجائے ان سے سبق لینا ہوگا، اسی طرح مستقبل درخشاں ہو سکتا ہے۔ لیکن آئندہ مفاسد کے سد باب اور اس طرح کی خرابیوں کا اعادہ نہ ہونے دینے کے لئے گذشتہ واقعات کی منصفانہ اور غیر جانب دارانہ تفتیش لابد ہے۔ اور محض تحقیقات پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ جو لوگ واقعی مجرم ثابت ہوں ان کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ خواہ وہ کتنے ہی بڑے اور اہم لوگ کیوں نہ ہوں، البتہ بے قصور لوگوں پر زد

نہیں آنی چاہئے، رورعایت کرنے اور کمزوری دکھانے سے مجرمین مزید ڈھیٹ ہوجاتے ہیں، اگر آپریشن نہ ہوا اور سڑے گلے اعضا سے چھٹکارا حاصل نہ کیا گیا تو زہر پوری یونیورسٹی میں پھیل جائے گا اور ناسور بن جائے گا۔ وائس چانسلر اور انتظامیہ نے بعض ملوث افراد کا اخراج کرکے ایک مناسب قدم اٹھایا ہے لیکن یہ ناکافی ہے، پتہ نہیں کیوں وائس چانسلر صاحب بے لاگ تحقیقات سے پہلوتہی کر رہے ہیں، مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کے معاملے میں پولیس کا رویہ بھی قابل توجہ ہے، اس کے لئے پولیس پر مقدمہ چلانے سے دریغ نہیں کرنا چاہئے، اس کا اقدام نہایت نامناسب اور بیجا تھا جس کی اسے سزا ملنی چاہئے، اس میں کوتاہی اور ٹال مٹول سے کام لینا بہت ضرر ناک ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کا نواں فقہی سمینار جامعۃ الہدایۃ جے پور میں ۱۱ تا ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ہوا، جس میں ہندوستان کے متعدد علاقوں کے علاوہ بیرون ملک کے مختلف مکاتب فکر کے علماء، فقہا، اصحاب افتا اور جدید علوم کے فضلا شریک ہوئے اور دور حاضر کے جن اہم مسائل کے بارے میں غور و خوض ہوا، وہ یہ ہیں:۔ شیرز کی شرعی حیثیت، قبضہ سے پہلے خرید فروخت۔ پانی کے اندر کی مچھلیوں کی تجارت، مشینی ذبیحہ کی شکلیں اور راجستھان میں انتہائے وقت سحر طلوع صبح صادق۔ گو فقہ اکیڈمی کی تجویزیں بڑے غور و خوض سے منظور کی جاتی ہیں تاہم کبھی کبھی بعض مسائل میں تجدد کا رنگ اور بعض میں جمود کی جھلک بھی آجاتی ہے۔ جے پور میں کئے جانے والے فیصلے تجاویز کی صورت میں اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں، اگر فقہ و اجتہاد میں بصیرت رکھنے والے اصحاب علم ان کی تائید و تردید میں مدلل اور محققانہ مضامین لکھیں تو ان کے لئے معارف کے صفحات حاضر ہیں۔

اردو دنیا میں اس وقت جناب رام لعل کا ماتم بپا ہے، وہ اردو کے اچھے اہل قلم اور ممتاز افسانہ نگار تھے، ان کا آبائی وطن مغربی پنجاب میں میانوالی تھا، لاہور میں تعلیم ہوئی اور وہیں سے ان کی ادبی و تحریری زندگی کا آغاز ہوا، تقسیم ہند کے بعد ہندوستان آئے اور ریلوے میں ملازم ہوئے، کچھ عرصہ دہلی میں گذرا پھر لکھنؤ آئے اور اندرا نگر میں مستقل بود و باش اختیار کرلی۔ وہ لکھنؤ کی ہر ادبی و تہذیبی سرگرمی کا جزء ہو گئے تھے۔ افسانہ نگاری ان کا

خاص میدان تھا، انہوں نے پاکستان اور بعض مغربی ملکوں کا سفر بھی کیا جن کے سفرنامے بھی لکھے۔ "زرد پتوں کی بہار" اور "خواب خواب سفر" اردو کے مقبول سفرنامے سمجھے جاتے ہیں۔ رام لعل صاحب کو ادبی خدمات کے صلے میں قومی سطح کے متعدد اعزاز حاصل ہوئے۔ پاکستان سے ملنے والے ایوارڈ کی رقم پاکستانیوں کو نذر کردی۔ وہ قرطاس و قلم سے ہی سروکار نہیں رکھتے تھے بلکہ بڑے عملی شخص بھی تھے۔ ان ہی کی دعوت پر لکھنؤ میں غیر مسلم اردو مصنفین کی عظیم الشان کانفرنس ہوئی۔ کل ہند اردو رابطہ کمیٹی کا قیام ان کی جد و جہد کا نتیجہ تھا، جس کے وہی صدر تھے۔ اس کے لئے انہوں نے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے ساتھ پورے صوبے کا دورہ کیا اور اردو کو دوسری زبان بنانے کی کامیاب مہم چلائی۔ اردو اکادمی اترپردیش کے وائس چیئرمین اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے، رام لعل جی اردو کی ہر مہم میں شریک رہتے اور اسے قوت پہنچاتے۔ اردو کے ایسے محسن کی موت اس کا بہت بڑا سانحہ ہے۔

اس ماہ دارالمصنفین میں کلکتہ سے پروفیسر ڈاکٹر مقبول احمد نے قدم رنجہ فرمایا اور بمبئی سے حکیم محمد مختار اصلاحی اپنے صاحبزادے حکیم محمد فیاض کے ہمراہ تشریف لائے، ان معزز مہمانوں نے دارالمصنفین کی فلاح و بہبود کے بارے میں مشورے دے کر اس سے اپنے اخلاص، ہمدردی اور تعلق کا ثبوت دیا جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔

قارئین معارف نے ۱۲/ نومبر کو ہونے والے بھیانک ہوائی جہاز حادثے کی خبر اخباروں میں پڑھی ہوگی، اس حادثہ میں راقم کے خویش ابو ریحان بھی جاں بحق ہوگئے جو ایک صالح اور صوم و صلوٰۃ کے پابند نوجوان اور مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ صاحب تدبر قرآن کے پوتے تھے۔ ہزار ضبط کے باوجود میرا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور اپنے ذاتی حادثہ کی اطلاع دینے کے لئے مجبور ہونا پڑا، مرحوم کی جسمانی یادگار تین بچیاں ہیں جو ابھی دس برس کی بھی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، معصوم بچیوں پر رحم فرمائے اور ان کے اور حادثہ میں ہلاک ہونے والے سب ہی لوگوں کے غم زدہ اعزہ کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین! اس دفعہ معارف کی اشاعت میں اسی لئے چند روز کی تاخیر ہوئی۔

مقالات

خاتمۂ فرعون اور شیخ اکبر

از جناب سید علیم اشرف جائسی صاحب

راقم کو اس مضمون کی تحریک ایک فاضل نوجوان سے غیر رسمی گفتگو سے ہوئی، جو ایک ذی استعداد اور باصلاحیت عالم دین ہیں، موضوع غالباً حضرت سید اشرف سمنانی کچھوچھوی متوفی ۸۰۸ھ/ ۱۴۰۶ء کی جلالت علمی اور ان کا فضل و کمال تھا، حضرت سید اشرف خاتمۂ فرعون کے مسئلے میں شیخ محی الدین ابن عربی کے مشہور موقف کے حامی و موید ہیں، اس حوالے سے یہ مسئلہ ہمارا موضوع بن گیا اور اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب فاضل موصوف نے نہایت شد و مد کے ساتھ ابن عربی کے موقف کی حمایت شروع کردی، مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے چند سالہ اغتراب اور ترک الوطنی میں ان کو تصوف و سلوک سے اس قدر گہری واقفیت ہوگئی ہے۔

میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے عرض کیا کہ: صوفیائے کرام کے تمام تر ادب و احترام کے ساتھ جمہور و جماعت سے ان کے "تفردات و انحرافات" کی تائید نہیں کی جائے گی اور زیر نظر موضوع میں تو اس کی ادنیٰ بھی گنجائش نہیں ہے کیونکہ فرعون کے کفر پر خاتمے اور اس کے معذب فی النار ہونے پر امت کا اجماع ہے اور خود صوفیائے کرام میں بھی ابن عربی کے اس نظریے کی تائید کرنے والوں کی تعداد معتدبہ نہیں ہے۔

ابھی میں تلاطم حیرت کے پہلے ہی حملے سے نبرد آزما تھا کہ ایک اور موج حیرت انگیز

وبلا خیز نے مجھے آلیا، فاضل موصوف نے فرمایا کہ: شیخ اسماعیل برسوی متوفی ۱۱۳۷ھ/ ۱۷۲۵ء نے ابن عربی کے اس موقف کو اختیار کیا ہے اور انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایمان فرعون کا قول نقل کیا ہے، میں نے عرض کیا کہ: تفسیر روح البیان میں اگرچہ بہت سے "مقاماتِ آہ و فغاں" ہیں لیکن "ایمانِ فرعون" جیسا خلاف جمہور قول اس میں ہے آسانی سے یقین کرنے والی بات نہیں ہے۔

رہا امام دار الہجرۃ کی طرف ایسے قول کی نسبت تو مطلق بے بنیاد ہے "خاتمہ فرعون" جیسے متفلسفانہ موضوعات اس دور میں تھے ہی نہیں اور یہ سب صدیوں بعد کی پیداوار ہیں، علاوہ ازیں امام مالک کی رائے موطا شریف، المدونۃ الکبریٰ اور بدایۃ المجتہد جیسی کتابوں سے لی جائے گی نہ کہ تفسیر روح البیان اور مثنوی مولانا روم سے۔

فاضل موصوف نے اپنے ترکش حیرت آفریں سے ایک اور تیر چلاتے ہوئے فرمایا کہ: حضرت محدث عبدالحق دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ/ ۱۶۵۳ء بھی ایمان فرعون کے قائل تھے اور اس کی دلیل انہوں نے یہ پیش کی کہ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں حضرت سید اشرف سمنانی کے ترجمے کے ضمن میں ان کا ایک مکتوب بنام قاضی شہاب الدین دولت آبادی بھی شامل کیا ہے[1] جو قضیۂ ایمان فرعون پر مشتمل ہے اور چونکہ شیخ نے اس مکتوب پر سکوت فرمایا ہے اور اس کا "رد و تعاقب" نہیں فرمایا ہے لہذا ثابت ہوا کہ وہ بھی اس رائے کے قائل تھے۔

اس طرز استدلال پر بہت کچھ کہا جا سکتا تھا... مگر میں نے صرف ایک گہری سانس لینے پر اکتفا کیا اور زیر لب "الی اللہ المشتکی..." کہہ کر خاموش رہا۔

دراصل آج مدارس میں جو معیار فضیلت ہے، اس قسم کا استدلال اسی کا شاخسانہ ہے ورنہ فاضل موصوف کے سلسلے میں میں اپنی گذشتہ رائے پر قائم ہوں اور اگر انہوں نے متاع لوح و قلم سے از خود سبکدوشی (SELF RETIREMENT) اختیار نہیں کیا تو مستقبل میں ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

ایرانی طرز فکر و نظر اور خراسانی انداز استدلال کے تسلط کا یہی طبیعی نتیجہ ہے ورنہ علمی و اسلامی اصول بحث و تحقیق سے اس کا کوئی رشتہ نہیں، یہ اسی کی کرشمہ سازی ہے کہ ہم کتب سیر و تاریخ سے علم توحید و کلام کے مسائل اخذ کرتے ہیں، کتب تصوف سے مسائل شرعیہ کا استنباط کرتے ہیں، نحو و صرف کی کتابوں کو فلسفہ و منطق کے غازہ سے سنوارتے ہیں اور کتب فتاوی میں متصوفانہ نظریات کی پچہ کاری کرتے ہیں اور ہم "لکل مقام مقال و لکل مقال رجال" کے پُر از حکمت قاعدے کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور یہ ایک عمومی حال ہے الا من رحم ربی و اتاہ بقلب سلیم، اس پر مستزاد یہ ہے کہ خانقاہ اور دار الافتا، صوفیہ اور فقہا کے درمیان کوئی خط امتیاز نہ رہا، ہر طرف "فقہائے متصوفین" اور "صوفیائے متفقہین" کی بھرمار ہے، مدرسہ سے نکلنے والا ہر طالب علم پہلی فرصت میں پیر طریقت بن جانا چاہتا ہے، چنانچہ مدارس جو مزرع علم و دانش اور منبع حکمت و آگہی ہیں، ان کے بارے میں عوام کا عمومی تاثر یہی ہے کہ وہ دعا تعویذ اور جھاڑ پھونک سکھانے کی تربیت گاہیں ہیں۔

اس طویل اور قدرے مملّ تمہید کے بعد آئیے اصل موضوع کی طرف فرعون کا کفر پر خاتمہ امت کا اتفاقی مسئلہ ہے، شیخ محقق حضرت محدث دہلوی فرماتے ہیں:

" وہمیں است معتقد تمامہ علماء و مجتہدین و مشائخ و متقدیان امت ولہذا ادے

در زبان شرع ہمہ جا مذموم و مقبوح و ضرب المثل کفر و استکبار آمدہ و چندیں آیات قرآنی ظاہر بلکہ نص در کفر و تقبیح و خبثیت اوست [1]

ابن حجر مکی کی کتاب "الزواجر" سے نقل کرتے ہیں کہ "کفر فرعون پر امت کا اجماع ہے [2] اور ابن عربی کے نظریے کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ "معلوم شد کہ ایں خلاف اجماع است ...." [3]

حضرت شیخ اسماعیل حقی نے بھی روح البیان میں شیخ اکبر کی تائید کرنے کی بجائے جمہور کی اتباع کی ہے [4] فالحمد للہ الذی لم یخیب ظنی بہ۔

اور حضرت امام مالک کا بھی کوئی ایسا قول مجھے روح البیان میں نظر نہیں آیا۔ جیسا کہ میرا یقین تھا۔ جس سے فرعون کے ایمان پر خاتمے کی تائید ہوتی ہو، البتہ ایمان باس و اضطرار کے سلسلے میں امام مالک کا ایک قول وہاں مذکور ہے۔

ایمان باس و اضطرار | حضرت اسمٰعیل حقی آیت کریمہ "حتی اذا ادرکہ الغرق قال [5]" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

...وایمان الباس موقوف	مشاہدہ عذاب اور وقت اضطرار
من جہۃ الرد والقبول وھو	کا ایمان بعض کے نزدیک مقبول
مقبول عند الامام مالک	اور بعض کے نزدیک غیر مقبول ہے
حکما بالظاہر کالمومن عند	اور وہ امام مالک کے نزدیک مقبول
سل السیف والمومن عند	ہے ظاہر پر حکم لگاتے ہوئے، جیسے
اقامۃ الحد علیہ یقبل	کہ تلوار کھنچ جانے اور حد جاری کرنے
ایمانہ وعلی ھذا انبنی کلام [1]	کے وقت ایمان لانے والے کا ایمان

حضرۃ الشیخ الاکبر فی الفصوص	مقبول ہوگا اور (امام مالک کی) اسی
وذھب الی ایمان فرعون ... [2]	(رائے) پر حضرت شیخ اکبر نے فصوص
	الحکم میں اپنے کلام کی بنیاد ڈالی ہے
	اور فرعون کے ایمان کی طرف گئے ہیں

اگر روایت صحیح ہے تو اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ ایمان باس و اضطرار امام مالک کے یہاں مقبول و معتبر ہے، لیکن درجنوں قرآنی نصوص و اجماع امت کی موجودگی میں جب تک کوئی صحیح اور صریح روایت کسی امام و مجتہد سے نہ ملے اس کی طرف ایمان فرعون کے قول کی نسبت کرنا علمی تقاضوں کے منافی ہے۔

اور صاحب روح البیان کا یہ کہنا کہ: امام مالک کی اسی رائے پر ابن عربی نے نصوص الحکم میں اپنے کلام کی بنیاد رکھی ہے۔ انکا اپنا خیال ہے ورنہ شیخ نے نصوص میں صراحۃً یا کنایۃً اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے [3] اور حق یہ ہے کہ ایمان باس و عذاب مقبول نہیں ہے، اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے:

ا۔ وَلَیْسَتِ التَّوْبَۃُ لِلَّذِیْنَ	توبہ ان کے لیے نہیں ہے جو گناہ
یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ	کرتے ہیں اور جب انہیں موت
اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ	آنے لگتی ہے تو کہتے ہیں: اب میں
الْئٰنَ [4]	توبہ کرتا ہوں
ب۔ فَلَمْ یَکُ یَنْفَعُھُمْ اِیْمَانُھُمْ	جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ
لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا [5]	لیا تو ان کے ایمان نے انہیں فائدہ
	نہیں دیا۔

خاتمہ فرعون

ج۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یغرغر[۱۱]

اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک اس کی سانس نہ اکھڑنے لگے۔

اس حدیث شریف کو امام ترمذی اور امام احمد نے بھی روایت کیا ہے[۱۲]

حضرت محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ: "ونزد بسیارے از علما توبۂ یاس مقبول است ولیکن ایمان یاس باتفاق واجماع مقبول نیست اکنوں لازم آمد کہ باجماع امت ایمان فرعون کہ در وقت ادراک غرق آورد مقبول نباشد"[۱۳]

اور اگر بفرض یہ مان لیا جائے کہ فرعون "رویت یاس" اور "غرغرہ" سے پہلے ایمان لے آیا تھا تو بھی اجماع امت کے سبب صرف نفی یاس اثبات ایمان کے لیے کافی نہیں ہے اور پھر قرآن مجید کی ان بے شمار آیات کی کیا توجیہ ہوگی جن میں صراحت کے ساتھ فرعون کے کفر واستکبار، سرکشی اور طغیان کا ذکر ہے۔

ا۔ وَاسْتَکْبَرَ ھُوَ وَجُنُوْدُہٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ[۱۴]

فرعون اور اس کے لشکر نے زمین میں ناحق تکبر کیا۔

ب۔ فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی[۱۵]

فرعون نے کہا کہ: میں سب سے بڑا رب ہوں۔

ج۔ اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی[۱۶]

فرعون کی طرف جاؤ بیشک اس نے سرکشی کی ہے۔

د۔ فَاَخَذْنٰہُ وَجُنُوْدَہٗ فَنَبَذْنٰھُمْ

ہم نے اسے اور اس کے لشکر کو پکڑا

فِی الْیَمِّ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الظّٰلِمِیْنَ[۱۷]

اور دریا میں ڈال دیا دیکھو کتنی بری ہے ظالموں کی عاقبت۔

ابن عربی کے موید ین کے لیے یہاں یہ کہنا فائدہ مند نہیں ہے کہ: جن دلائل میں اس کے کفر کا تذکرہ ہے تو وہاں اس کے ایمان لانے سے پہلے کے واقعات کو بطور حکایت بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ متعدد ایسی آیتیں ہیں جن میں وضاحت کے ساتھ قیامت کے دن بھی اس کے "مقبوح ومعذب" ہونے کا ذکر ہے۔

ا۔ وَاَتْبَعْنٰھُمْ فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا لَعْنَۃً وَیَوْمَ الْقِیَامَۃِ ھُمْ مِنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ[۱۸]

ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت کو ڈال دیا اور بروز قیامت وہ لوگ رحمت الٰہی سے دور ہوں گے۔

ب۔ وَیَوْمَ الْقِیَامَۃِ لَا یُنْصَرُوْنَ[۱۹]

اور قیامت کے دن وہ سب بے یار ومددگار رہوں گے۔

ان آیات کے باوجود بھی یہ عجیب وغریب بات کہی جاتی ہے کہ: فرعون کو اس کے مظالم ومعاصی کی سزا تو ملے گی مگر اپنے ایمان کی بدولت اسے جہنم میں خلود نہ ہوگا مگر یہ تاویل اس لیے قابل قبول نہیں ہے کہ فرعون کا دعویٰ ایمان بالکل آخری وقت کا تھا لہذا فرعون کو مومن ماننے کی صورت میں اسے عارضی طور پر بھی معذب نہیں مانا جاسکتا، اس لیے کہ

الاسلام یجب ما قبلہ[۲۰]

اسلام (لانا) گذشتہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

اور

لا الٰہ لا یسبقھا عمل ولا

کوئی بھی عمل کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے بڑھ

تترك ذنبا [۳۱] — نہیں سکتا اور یہ کوئی بھی گناہ باقی نہیں چھوڑتا۔

اور اسے معذب ماننے کی صورت میں صاحب ایمان نہیں مانا جا سکتا اور یہی شیخ اکبر کی رائے ہے لکھتے ہیں کہ:

فقبضه (الله تعالیٰ) طاهرا مطهرا ليس فيه شئ من الخبث لانه قبضه عند ايمانه قبل ان يكتسب شيئا من الآثام [۳۲]	اللہ تعالیٰ نے اسے (دنیا سے) ایسا پاک وصاف اٹھایا کہ اس میں کوئی برائی نہیں تھی کیونکہ اس کی موت ایمان کے ساتھ ہوئی تھی اور اس کے بعد اس نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ایمان و دوزخ میں منافات نہیں ہے مگر فرعون جیسے شخص کے ایمان اور دوزخ میں یقیناً منافات ہے۔

کفر فرعون کی مزید شہادتیں ۱۔ اگر فرعون کو دولت ایمان مل جاتی تو وہ دنیا و آخرت کے عذاب میں مبتلا نہ ہوتا "فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى" [۳۳] اور نہ اس کی ذات ڈرنے والوں کے لیے نشان عبرت ہوتی۔ "اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى" [۳۴]

۲۔ "وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ" [۳۵] یعنی ہم نے انہیں عمائدین (شرک) بنادیا جو آگ کی طرف بلاتے ہیں۔

۳۔ "يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ" [۳۶] یعنی فرعون بروز قیامت اپنی قوم کی قیادت کرے گا اور انہیں جہنم پہونچائے گا۔

یہاں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ وہ اپنی قوم کو جہنم میں پہونچائے گا، مگر خود

نہیں جائے گا لیکن یہ ایک کمزور سی بات ہے جو عربی اسالیب سے ناواقفیت کی دلیل ہے "یَقْدُمُ قَوْمَهٗ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی قیادت کرتے ہوئے جہنم میں جائے گا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

يؤتى القرآن يوم القيامة واهله الذين يعملون به تقدمه سورة البقرة وآل عمران [۳۷]	قیامت میں قرآن اور اس پر عمل کرنے والوں کو لایا جائے گا جس کی قیادت سورۃ البقرہ اور آل عمران کررہی ہوں گی۔

یہاں دونوں سورتوں کو قرآن سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

عربی کے مشہور شاعر امرؤالقیس کی مذمت کرتے ہوئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

يقدم الشعراء الى النار [۳۸]	وہ شعراء (غیر مومنین) کی قیادت کرتے ہوئے جہنم میں جائے گا۔

عربی اسلوب کے مطابق میرے اس قول "قدم فرعون قومه يوم الغرق فاوردهم النيل" کا مطلب یہ ہوا کہ فرعون غرقابی کے دن اپنی قوم کی قیادت کرتے ہوئے دریائے نیل میں اترا۔

۴۔ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ [۳۹]	لعنت میں دنیا و آخرت میں فرعون اور اس کے پیروؤں کا تعاقب کیا اور کتنا برا انعام انہیں ملا۔

۵۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام اس پر

آمین کہتے ہیں:

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤی اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ [۳۰]

اے اللہ فرعون اور اس کے گروہ کے مال و دولت کو تباہ کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب دیکھیں۔

اس دعا پر اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتے کہ: اے موسیٰ و ہارون ہم تمہاری دعا کو قبول نہیں کر سکتے اس لیے کہ فرعون کے لیے آخری وقت میں ایمان لانا مقدر ہے بلکہ فرمایا جا رہا ہے:

قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا۔ — بے شک تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔

میں نہیں سمجھتا کہ فرعون کے کفر و عذاب پر جزم و یقین کرنے کے لیے کسی کو اس سے زیادہ واضح دلیل کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

۶۔ ایمان فرعون کے مویدین جس آیت سے استدلال کرتے ہیں وہ یہ ہے:

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ [۳۱]

میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں سوا اس کے جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمانوں میں ہوں۔

مگر ظالم کا لب و لہجہ دیکھئے کہ موت کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی اس کے منہ سے یہ نہیں نکلتا کہ "آمنت باللہ" بلکہ صرف خوف و لالچ کے سبب خدائے بنو اسرائیل پر ایمان لانے کی بات کر رہا ہے تاکہ بنو اسرائیل کی طرح شاید اسے بھی نجات مل جائے۔

امام ابن حجر ہیثمی "الزواجر" میں فرماتے ہیں کہ: اگر فرعون کے اس ایمان کو مان بھی لیا جائے تو بھی ایمان بالرسالۃ کے بغیر یہ مقبول و مکمل نہیں، یہ بات فرعون کے جادوگروں کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی کیونکہ انہوں نے کہا تھا:

اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ رَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ [۳۲]

ہم سارے جہاں کے رب پر ایمان لائے جو موسیٰ و ہارون کا رب ہے۔

اور یہاں رسالت پر ایمان موجود ہے [۳۳]

فرعون کے اس نام نہاد ایمان کے ذکر کے بعد اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے:

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ [۳۴]

کیا اب (حالت اضطرار میں اور موت پاس کے بعد ایمان کی بات کرتا ہے) اور اس سے پہلے نافرمانیاں کیں اور فسادیوں میں سے تھا۔

عربی زبان کے عرف و اسالیب سے باخبر حضرات یہ بات جانتے ہیں کہ ایسے مقام پر "الآن" یا "ءالآن" کا مفہوم یہی ہوتا ہے، شاعر کہتا ہے:

الآن وقد علقت مخالبنا بہ
یرجو النجاۃ ولات حین مناص

کیا اب جبکہ وہ پنجوں میں لپٹ (آ) چکا ہے رہائی کی توقع رکھتا ہے حالانکہ اب چھٹکارے کا کوئی وقت نہیں۔

آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ "ءالآن تومن ولات حین الایمان" یعنی کیا اب ایمان لاتا ہے جبکہ ایمان کا وقت نہیں رہا۔

اللہ تعالیٰ آگے ارشاد فرماتے ہیں:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ
لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً ۳۵

میں تیرے (بے روح جسم کو آج دریا سے) باہر نکالوں گا تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے (عبرت کی) نشانی ہوجائے۔

یہاں "نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ" کا ترجمہ (میں تیرے بدن کو نجات دوں گا) کرکے یہ کہنا کہ نجات یافتہ بدن کی روح معذب نہیں ہوسکتی، سطحی بات ہے جو قرآن مقدس کے حضور جرات بے جا کے مترادف ہے اور خوف الٰہی سے تہی اور بے پروا ہونے کی علامت بھی۔

محدثین وصوفیہ دونوں کی تفسیروں میں مذکورہ بالا آیت کا وہی مفہوم و معنی ملتا ہے جسے میں نے اردو کے قالب میں پیش کیا ہے ۳۶

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کے مطابق بنو اسرائیل پر فرعون کی ایسی دہشت تھی کہ اس کی غرقابی کو آنکھوں سے دیکھ کر بھی اس کی موت کے بارے میں مشکوک تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی لاش کو دریا سے باہر نکال دیا تاکہ وہ اسے دیکھ کر مطمئن ہوجائیں ۳۷

قرآن پاک میں ۷۴ بار نام لے کر ۳۸ اور سینکڑوں دوسری آیتوں میں بغیر نام لیے فرعون کا ذکر ہے اور ہر جگہ اس کا تذکرہ کفر و استکبار، طغیان و معصیت کے ساتھ ہی ہے۔ اگر اس کا ایمان مقبول ہوا ہوتا تو اولاً اس کے سابقہ گناہوں کا تذکرہ ہی نہ ہوتا اور ثانیاً اگر ہوتا بھی تو اس کے ایمان کی قبولیت اور نجات کا ذکر بھی یقیناً خوب صراحت کے ساتھ ہوتا۔

غزوۂ بدر میں جب ابوجہل مارا گیا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مات فرعون ھذہ الامۃ" اگر فرعون مومن مرا ہوتا تو قطعی اور یقینی کافر اور جہنمی کو اس سے تشبیہ نہ دی جاتی اس لیے کہ شرعاً ایمان لانے کے بعد سابقہ کفر و معصیت کی تشبیہ و مثال

نہیں دی جاسکتی۔ ۳۹

شیخ ابن عربی

حضرت شیخ اکبر شرقی اندلس کے مرسیہ نامی شہر میں ۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء میں پیدا ہوئے ان کا شجرۂ نسب صحابی رسول عدی بن حاتم الطائی کے بھائی عبداللہ تک پہونچتا ہے ابتدائی تعلیم اشبیلیہ میں حاصل کی اور ۵۹۸ھ/۱۲۰۲ء میں اندلس سے نکل کر مصر پہونچے اور حجاز، عراق اور بلاد شام کی سیاحت فرمائی اور ایک طویل مدت تک حرم شریف کی مجاورت فرمائی، ابن عساکر اور ابن جوزی وغیرہ محدثین سے حدیث کی سماعت کی اور اجازت حاصل کی، مجدالدین فیروز آبادی کے مطابق ان کی تصانیف کی تعداد چار سو سے زیادہ ہے، ۶۳۸ھ/۱۲۴۱ء میں دمشق میں وفات ہوئی اور فسیح قاسیون میں ان کی تدفین ہوئی، تاریخ وفات "مات قطب ہمام" ہے ۴۰

ابن عربی کی شخصیت، شطحات اور انفرادی آرا کے سبب ہمیشہ متنازع فیہ رہی ہے، کسی نے ان کو ملحد ٹھہرایا تو کسی نے قطب وقت قرار دیا، شیخ الاسلام علاء البخاری نے آپ کے رد میں ایک کتاب "فاضحۃ الملحدین" تصنیف فرمائی ۴۱ تو امام سیوطی نے ان کے دفاع میں "تنبیہ الغبی علی تنزیہ ابن عربی" ۴۲ اور امام شعرانی نے ان کے فضل و کمال کے بیان میں "الکبریت الاحمر فی بیان علوم الشیخ الاکبر" ۴۳ تصنیف کی، اہل سنت کی اکثریت ان سے حسن ظن رکھتی رہی ہے اور ارباب تصوف تو بالاتفاق ان کی امامت اور علو مرتبت کے قائل رہے ہیں۔

موقف ابن عربی

خاتمۂ فرعون کے سلسلے میں شیخ اکبر کا مشہور قول ان کی کتاب فصوص الحکم میں وارد ہوا ہے، اس کے ذکر سے پہلے قرآن کی اس آیت کا پس منظر پیش کردوں جس پر شیخ نے اپنے استدلال کی بنا ڈالی ہے، سورۃ القصص میں اللہ تعالیٰ فرعون کے ظلم و فساد اور اس کی طرف سے اسرائیلی بچوں کے قتل عام کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے کہ: ہم نے

حضرت موسیٰ کی ماں کی طرف الہام کیا کہ اگر اسے اپنے بچے کی زندگی کا خوف ہو تو وہ اسے دریا میں ڈال دیں ہم اس کی حفاظت کرنے والے اور اسے منصب رسالت پر فائز کرنے والے ہیں، بعد میں فرعون نے دریا سے نکال کر ان کے قتل کا ارادہ کیا تو فرعون کی بیوی نے کہا:

قرۃ عین لی ولك لا تقتلوہ	یہ بچہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک
عسیٰ ان ینفعنا او نتخذہ ولدا[44]	ہے اسے قتل مت کرو شاید یہ ہمیں نفع
	پہونچائے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں۔

شیخ اکبر اپنی کتاب فصوص الحکم کے پچیسویں "فص" میں جس کا نام انہوں نے "حکمۃ علویہ فی کلمۃ موسویہ" رکھا ہے، فرماتے ہیں کہ:

فقالت - وکانت منطقۃ بالنطق	فرعون کی بیوی نے کہا اور وہ الہام
الالٰہی - فیما قالت لفرعون،	خداوندی کے زیر اثر بول رہی تھی اس لیے
اذ کان اللہ تعالیٰ خلقھا للکمال	کہ اللہ تعالیٰ نے اسے "کمال" کے لیے
کما قال علیہ (الصلاۃ) والسلام	بنایا تھا جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ
... فقالت لفرعون فی حق موسیٰ	علیہ وسلم نے فرمایا... تو اس نے حضرت
انہ "قرۃ عین لی ولك" فیہ قرت	موسیٰ کے بارے میں فرعون سے کہا کہ
عینھا بالکمال الذی حصل لھا[45]	"یہ ہماری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک
... وکان قرۃ عین لفرعون	ہے" چنانچہ آپ ہی کے ذریعے اس کی
بالایمان الذی اعطاہ اللہ	آنکھ ٹھنڈی ہوئی اس کمال کے ساتھ
عند الغرق فقبضہ طاھرا	جو اسے حاصل ہوا اور فرعون کی آنکھ
مطھرا...[46]	بھی ٹھنڈی ہوئی اس ایمان کے ساتھ
	جو اللہ تعالیٰ نے اسے ڈوبتے وقت
	عطا کیا اور اسے ایسا پاک وصاف
	اٹھایا...

شیخ اکبر آگے فرماتے ہیں:

فکان موسیٰ علیہ السلام کما	موسیٰ علیہ السلام ویسے ہی ہوئے
قالت امرأۃ فرعون فیہ انہ	جیسا کہ فرعون کی بیوی نے ان کے
"قرۃ عین لی ولك (...) عسیٰ ان	بارے میں کہا تھا: ہماری اور تمہاری
ینفعنا" وکذلك وقع فان اللہ	آنکھوں کی ٹھنڈک شاید یہ ہمیں نفع
نفعھما بہ علیہ السلام[47]	پہونچائے اور ایسا ہی ہوا چنانچہ
	اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو حضرت
	موسیٰ کے ذریعے نفع پہونچایا۔

خاتمہ فرعون کے سلسلے میں فصوص الحکم میں مذکور شیخ کے اجتہاد کی نسبت اگر ان کی جانب صحیح ہے تو وہ بے شمار آیات واحادیث کے نصوص وظواہر سے متعارض، اجماع امت سے متصادم اور عقل وقیاس کے مخالف ہے

شیخ کے اس قول کو لے کر امت کے اہل علم تین گروہ میں منقسم ہو گئے۔

ا۔ وہ حضرات جنھوں نے شیخ کی محبت اور فضل وکمال کے زیر اثر ایمان فرعون سمیت ان کے تمام تفردات میں ان کی حمایت کی اور اس سلسلے میں دور از کار تاویلات سے کام لیا۔

ب۔ وہ حضرات جنھوں نے ان اقوال کے ساتھ ساتھ شیخ کے تمام تر فضل و

کمال سے بھی انکار کر دیا ان میں زیادہ تر سخت موقف رکھنے والے محدثین کرام ہیں۔

ج۔ علماء امت کی اکثریت ان حضرات پر مشتمل ہے جنھوں نے شیخ کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے مگر ان کے اقوال شاذہ اور "اجتہادات خاصہ" میں ان کی تائید نہیں کی ہے، انہیں میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ مسئلہ خاتمہ فرعون اور دوسرے تمام خلاف شرع مسائل جو شیخ اکبر سے منسوب اور ان کی کتابوں میں موجود ہیں سب کے سب غلط اور الحاقی ہیں، امام شعرانی فرماتے ہیں: وجمیع ما عارض من کلامہ ظاہر الشریعة وما علیہ الجمهور فهو مدسوس۔[48]

اور آج کے دور میں جبکہ مسلمانوں کی علمی میراث کی تاریخ مرتب ہو رہی ہے، دنیا بھر کے کتب خانوں اور علمی نوادر کی فہارس شایع ہو چکی ہیں اور ہزاروں کمیاب و نایاب مخطوطات تحقیق کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں، اس بات کو سمجھنا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ ہمارے سامنے بے شمار شواہد موجود ہیں کہ ماضی میں نہ صرف بعض مسائل بلکہ پوری پوری کتابیں دوسروں کے نام منسوب ہو گئی ہیں، ایک ہی کتاب کے مختلف نسخوں کے تقابل سے واضح ہوا کہ بعض میں بہت سی الحاقی عبارتیں شامل ہیں، زنادقہ کو اس کام میں خاص ملکہ حاصل تھا۔[49] اور شیخ کی کتابوں میں تو ہر دور میں الحاق کی شہرت رہی ہے چنانچہ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ بخاری نے ان کی تکفیر سے کف لسان کیا تھا۔

مسئلہ ایمان فرعون یقیناً الحاقی ہے کیونکہ ایک طرف تو یہ شیخ کے اس مقام و منزلت کے منافی ہے جس کا ذکر امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے امام عزالدین عبدالسلام، امام ذہبی مجدالدین فیروز آبادی، امام رازی، امام سبکی اور درجنوں دوسرے اکابر کے

حوالے سے کیا ہے،[50] اور دوسری طرف یہ شیخ کی اپنی تحریروں سے بھی متصادم ہے۔

امام شعرانی آگے فرماتے ہیں کہ: فتوحات مکیہ کو مختصر کرتے ہوئے مجھے کئی مقام پر توقف تھا جسے میں نے حذف کر دیا تھا لیکن جب میری ملاقات شیخ ابوطاہر شاذلی مغربی سے ہوئی تو انہوں نے مجھے فتوحات کا ایک ایسا نسخہ دکھایا جس کا مقابلہ انہوں نے شیخ اکبر کے ہاتھ سے لکھے ہوئے قونیہ میں موجود نسخے سے کیا تھا، اس میں وہ مقامات نہیں ملے جن میں مجھے تردد تھا۔[51]

یہی امام شعرانی اپنی کتاب "لواقح الانوار القدسیہ المنتقاة من الفتوحات المکیہ" میں ایسے ہی ایک اور واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: "پھر میں جان گیا کہ اس وقت مصر میں موجود فتوحات کے تمام نسخے اسی الحاقی نسخے سے لکھے گئے ہیں جن میں شیخ پر دسیسہ کاری کی گئی ہے جو اہل سنت کے عقاید کے خلاف ہے، کما وقع لہ ذلك فی کتاب الفصوص وغیرہ۔[52] جیسا کہ فصوص الحکم وغیرہ کتابوں میں انہیں پیش آیا۔

خاص مسئلہ ایمان فرعون کے بارے میں امام شعرانی فرماتے ہیں کہ:

ذلك كذب وافتراء علی الشیخ۔[53] یہ جھوٹ اور شیخ پر افترا ہے۔

وہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ میں نے خود شیخ اکبر کے ہاتھ سے لکھی ہوئی فصوص دیکھی ہے اس میں نجات فرعون کے سلسلے میں کچھ نہ تھا۔[54]

مذکورہ بالا دلائل سے قطع نظر اس مسئلہ کے الحاقی ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ خود شیخ اکبر نے فتوحات میں فرعون کو متعدد بار کافر اور خالد فی النار قرار دیا ہے۔ میرے پیش نظر وہ نسخہ ہے جو قونیہ میں موجود اس نسخے کے مطابق ہے جس پر شیخ کی تحریر ہے۔

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ: جہنم میں جانے والے دو قسم کے ہیں ایک تو مومنین میں سے گناہ کبیرہ کے مرتکبین جو شفاعت شافعین سے باہر آجائیں گے اور دوسرے وہ جنہیں جہنم میں خلود و دوام ہوگا۔

وھولاء المجرمون اربع طوائف کلھا فی النار لا یخرجون منھا وھم المتکبرون علی اللّٰہ تعالیٰ کفرعون وامثالہ ...[55]	اور ان مجرمین کے چار گروہ ہیں سب کے سب جہنم میں ہوں گے جہاں سے نہیں نکلیں گے اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں تکبر کرنے والے ہیں جیسے فرعون اور اس جیسے دوسرے۔

طوالت کے خوف سے اسی ایک مقام کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے جو الحمد للہ تعالیٰ تنہا میرے مطلب کے اثبات کے لیے کافی ہے کہ فصوص میں موجود ایمان فرعون سے متعلق عبارت الحاقی اور جعلی ہے، امام شعرانی کی تصریح کے مطابق فتوحات ان کی آخری تصنیف ہے جسے اپنی وفات سے صرف تین سال قبل مکمل کیا تھا[56] جبکہ فصوص کی تصنیف ۶۲۷ھ میں ہوئی، لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فتوحات میں آپ نے ایک عام بات فرمائی اور فصوص میں اپنا خصوصی اجتہاد ذکر فرمایا ہے۔

بعض حضرات ایمان فرعون کے مسئلے کو فتوحات کی عبارات و تصریحات کے پیش نظر "مرجوع عنہ" کہتے ہیں[57] لیکن اگر ایسا ہوتا تو شیخ اپنے رجوع کی طرف ضرور اشارہ کرتے۔

بعض دوسرے علماء نے فرمایا کہ ایمان فرعون سے شیخ کی مراد نفس کے رجوع الی اللہ سے ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ع "ونفسی فرعون والھوی ھامانی"[58] مگر فصوص میں موجود عبارت کے پیش نظر یہ بات قابل قبول نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ زنادقہ نے اسی سے تحریک پاکر ایمان فرعون کو فصوص میں داخل کر دیا ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر طرح سے یہی بات متعین ہوتی ہے کہ فصوص میں موجود ایمان فرعون کا قول الحاقی ہے اور شیخ اکبر کی شخصیت اس سے بری ہے اور اگر کسی طرح سے بفرض محال شیخ کی طرف اس قول کی نسبت ثابت ہو جاتی ہے تو اسے خطائے اجتہادی قرار دیا جائے گا، عصمت تو صرف انبیائے کرام کے لیے متحقق ہے۔

ان اردت الا الاصلاح واللّٰہ من وراء القصد غفرانک یارب من کل ذنب ارتکبتہ فی حقک او حق کائن من کان من عبادک واتوب الیک وصل وسلم علی نبینا وآلہ وصحابتہ وحملۃ العلم والعرفان من امتہ اجمعین۔

حواشی وحوالے

[1] اخبار الاخیار (اردو ترجمہ مولانا سبحان محمود) کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی (بغیر تاریخ)، ۳۵۸ [2] تکمیل الایمان وتقویۃ الایقان، دہلی: (بغیر مکان وتاریخ نشر)، ۵۹ [3] تکمیل الایمان ۶۸ [4] ایضاً، ۶۴ [5] اسلامبول: مطبعہ عثمانیہ، ۱۳۳۰ھ، ۴: ۷۶ [6] سورۂ یونس ۱۰: ۹۰ [7] روح البیان، مرجع سابق، ۴: ۷۷ [8] فصوص الحکم، کراچی: ایجوکیشنل پریس، بار اول، ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء، ۶۵۷، ۶۵۸ [9] النساء ۴: ۱۸ [10] غافر، ۴۰: ۸۵ [11] سنن ابن ماجہ، ابواب الزہد، باب ذکر التوبہ، لاہور: فرید بک اسٹال، بار اول ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء، ۲: ۵۰۳، اس حدیث کو امام ترمذی اور امام احمد نے بھی روایت کیا ہے [12] المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی، پروفیسر ونسنک وغیرہ، لیڈن: بریل، ۱۹۶۲ء، ۴: ۴۸۰ [13] تکمیل الایمان، ۵۸ [14] القصص، ۲۸: ۳۹ [15] النازعات، ۷۹: ۲۴ [16] طہ، ۲۰: ۴۳ [17] القصص ۲۸: ۴۰ [18] ایضاً، ۲۸: ۴۲ [19] ایضاً ۲۸: ۴۱ [20] مسند امام احمد نقلاً عن المعجم المفہرس لالفاظ

الحدیث النبوی، مرجع سابق، ۱، ۱۹۳۶ : ۳۱۶ [21] ابن ماجہ، مرجع سابق، ابواب الذکر، باب
فضل لا الٰہ الا اللہ، ۲۰ : ۳۴۴ [22] فصوص الحکم، مرجع سابق، ۶۵۸ [23] النازعات ۷۹:
۲۵ [24] نفس سورہ، آیت رقم، ۲۶ [25] القصص، ۲۸ : ۴۱ [26] ہود، ۱۱ : ۹۸ [27] صحیح مسلم
(شرح علامہ سعیدی) کتاب فضائل القرآن، باب فضل قراءۃ القرآن وسورۃ البقرہ، لاہور:
فرید بک اسٹال، بار سوم، ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء، ۲ : ۵۸۴ [28] تکمیل الایمان (اردو ترجمہ: اقبال
احمد فاروقی) الٰہ آباد: حبیب المطابع، ناشر مکتبۃ الحبیب، ۱۹۷۵ء، ۱۳۱ [29] ہود، ۱۱ : ۹۹
[30] یونس، ۱۰ : ۸۸ [31] نفس سورہ، آیت رقم، ۹۰ [32] الشعراء، ۲۶ : ۴۸ [33] تکمیل الایمان
(اردو) مرجع سابق، ۱۴۰ [34] یونس، ۱۰ : ۹۱ [35] نفس سورہ، آیت رقم، ۹۲ [36] تفسیر القرآن
الکریم، ابوالفدا اسماعیل ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ/۱۳۷۳ء، بیروت: دارالفکر للطباعۃ والنشر
والتوزیع، بار اول، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء، ۲ : ۴۳۰-۴۳۲، وروح البیان، مرجع سابق، ۴ :
۷۷، ۸۰ [37] تفسیر الجلالین، جلال الدین محلی وجلال الدین السیوطی، بیروت، دارالفکر، بار دوم
۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء ۲۲۹ [38] المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، محمد فواد عبدالباقی، بیروت
داراحیاء التراث العربی، ۵۱۵، ۵۱۶ [39] تکمیل الایمان (اردو) مرجع سابق، ۱۳۵،
[40] فتوحات مکیہ کی آخری جلد میں "خاتمہ" کے عنوان سے شیخ اکبر کے مفصل سوانح حیات مذکور
ہیں، دیکھئے "الفتوحات المکیہ"، مصر: دارالکتب العربیۃ الکبری، ۱۳۲۹ھ، ۴ : ۵۵۴-۵۶۱
"الیواقیت والجواہر" امام شعرانی، قاہرہ: مصطفیٰ البابی الحلبی ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۹ء، ۱ : ۹ [41]
حاشیہ لحظ الالحاظ، شیخ زاہد الکوثری، دمشق: مطبعۃ التوفیق، ۱۳۴۷ھ، ۳۰۵، ۳۰۶، زاہد الکوثری
متوفی ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء اپنے حاشیے میں فرماتے ہیں کہ: علاء بخاری، شیخ سعد الدین تفتازانی
کے بڑے شاگردوں میں سے تھے، علوم عقلیہ، پرہیزگاری اور دقت نظر میں اللہ کی نشانیوں میں

سے تھے، انہوں نے نہ صرف شیخ ابن تیمیہ کی تکفیر کی، بلکہ وہ انہیں "شیخ الاسلام" کہنے والوں
کو بھی کافر قرار دیتے تھے۔ شیخ علاء کی کتاب "فاضحۃ الملحدین" کا تذکرہ غالباً خیرالدین زرکلی نے
اپنی کتاب "الاعلام" میں کیا ہے [42] خاتمۃ الفتوحات المکیۃ، لیکن امام شعرانی نے اس کتاب کا
نام "تنبیہ الغبی فی تبرئۃ ابن عربی" لکھا ہے [43] یہ کتاب "الیواقیت والجواہر" کے حاشیہ پر
شایع ہوئی ہے، مرجع سابق [44] ۲۸ : ۹ [45] رواہ الامام البخاری فی الجامع الصحیح عن ابی
موسیٰ الاشعری، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "کمل من الرجال کثیر
ولم یکمل من النساء الا مریم بنت عمران وآسیۃ امراۃ فرعون وفضل عائشۃ
علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام" (مردوں میں بہت سے کاملین ہوئے مگر عورتوں
میں مریم بنت عمران اور آسیہ زوجہ فرعون کے علاوہ کوئی کامل نہیں ہوا اور عائشہ کی فضیلت
عورتوں پر ویسی ہی ہے جیسی کہ "ثرید" کی فضیلت بقیہ کھانوں پر)۔ (کتاب المناقب، باب فضل
عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، دہلی: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، بار سوم، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، ۲ : ۴۱۹-
غالباً شیخ نے اسی حدیث شریف کی طرف اشارہ کیا ہے [46] فصوص الحکم، مرجع سابق، ۶۵۸ [47]
نفس مرجع، نفس صفحہ [48] الیواقیت والجواہر، مرجع سابق، ۱ : ۷ [49] ایضاً، وعامۂ کتب بحث وتحقیق
[50] ایضاً، ۱ : ۷-۱۱ [51] نفس مرجع، ۱ : ۷ [52] خاتمہ الفتوحات المکیہ، مرجع سابق [53] الیواقیت
والجواہر، مرجع سابق، ۱ : ۱۳ [54] ترجمہ فصوص الحکم (اردو) عبدالقدیر صدیقی، دہلی:
اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، بار اول ۱۹۷۸ء، ۱۰۴ [55] الفتوحات مرجع سابق، فصل اول
باب: ۶۲، مراتب اہل النار، ۱ : ۳۰۱ [56] الیواقیت والجواہر نفس مرجع ۱ : ۱۳ [57]
ترجمہ روح البیان، محمد فیض احمد اویسی، بہاولپور: مکتبہ اویسیہ ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، تحت آیت
۱۰، ۹۰-۹۲ [58] خاتمۃ الفتوحات، مرجع سابق۔

مظہر کا وطن

از ڈاکٹر رفیع الدین کاظمی۔ لکھنؤ

عہد تغلق کا آغاز خلجی دور کے بعد ۷۲۰/۱۳۲۰ء سے شروع ہوکر ۸۲۴/۱۴۲۱ء کو ختم ہوا۔ اس خاندان کے تیسرا حکمران فیروز شاہ تغلق نے ۷۲۶ـ ۷۵۰/ ۱۳۲۵-۱۳۵۱ء تقریباً چوبیس سال حکومت کی۔ یہ حکمران ذی علم تھا عربی اور فارسی لغات پر دسترس تھی۔ علوم دین کے ساتھ علوم مروجہ سے بھی واقف تھا۔ بلند پایہ شاعر بھی تھا۔ اس کے دربار میں علمائ، فضلائ، سخن نگار اور شعراء کا مجمع رہا، بیش قیمت تصانیف عالم وجود میں آئیں۔ مذہبی کتب میں فتاویٰ فیروز شاہی۔ فتاویٰ جہانداری۔ فتاویٰ تاتار خانی۔ تفسیر تاتاری۔ فقہ فیروز شاہی۔ فوائد فیروز شاہی اور دلائل فیروز شاہی اہم تصانیف تھیں۔ ضیاء الدین برنی۔ شمس سراج الدین عفیف اور اعز الدین خالد خانی نے تاریخ فیروز شاہی تحریر کیں۔ شعراء کی معتد بہ تعداد تھی۔ ان میں ایک اہم شخصیت مظہر کی تھی جو عالم فاضل اور بلند پایہ صاحب دیوان شاعر تھا اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کا مرید بھی تھا۔

مظہر کا وطن پردۂ خفا میں ہے جس کے بارے میں کسی بھی مورخ یا تذکرہ نگار نے صاف الفاظ میں نہیں لکھا، کسی نے اس کی علمیت اور فضیلت کا ذکر کیا کسی نے ایرانی نہاجر بتایا، کسی نے گجراتی۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے نام کے ساتھ لفظ کڑا جڑا ہوا ہے مگر کس کڑا کی بات ہے واضح نہیں ہے، مظہر نے بھی اپنے کلام میں نہ تو وطن کے بارے میں

لکھا اور نہ ہی خاندان کے بارے میں۔ صرف خاندان کے ذی علم اور معروف ہونے نیز اس پر نازاں ہونے کی بات ان دو اشعار میں بیان کی ہے۔

مرا خویش و فرزند و خیل و تبار	فزوں از ہزار اند اگر بشمری
من ہم نشین شاہم و ہم نژاد خان	من ہمدم امیرم و ہمہ وزیر

وطن مظہر کی تلاش کے سلسلے میں پروفیسر سید حسن، ڈاکٹر وحید مرزا۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور شمعون اسمٰعیلی نے تذکرہ نگاروں کے اقوال اور کلام مظہر کا غائر اور تفصیلی مطالعہ کرکے طویل اور پُر مغز مضامین لکھے مگر وطن کے بارے میں کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکے ڈاکٹر شعیب اعظمی نے عہد تغلق میں فارسی ادب پر مقالہ تحریر کرکے ڈاکٹر کی سند حاصل کی انھوں نے مظہر گجراتی لکھا ہے، مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی کڑا کے بارے میں تفتیش نہیں کی صرف گجرات کے اردگرد ہی رہے ورنہ تذکرہ نگاروں کے اقوال اور مظہر کے مذکورہ اشعار کا دقت نظر سے تجزیہ کرنے کے بعد اس کے وطن کے بارے میں کسی نتیجہ پر پہونچنا ممکن ہوتا۔ راقم الحروف کی معلومات کے مطابق تین کڑا ہیں۔ ایک آگرہ کے نواح میں دیہات۔ دوسرا گجرات کا قصبہ اور تیسرا دریائے گنگا کے داہنے پر آباد قدیم آبادی جو شہر کڑہ کے نام سے اسلامی اور غیر اسلامی دور میں معروف رہی اور اس مقام کی اہمیت کے پیش نظر ریاست یا صوبہ بھی اسی نام سے تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ کڑہ کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ تذکرہ نگاروں اور مورضین کے اقوال کا ایک بار جائزہ لے لیا جائے۔

۱۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور ملا عبد القادر بدایونی نے "مظہر کڑہ" لکھا ہے، یہ دونوں قریب العہد ہیں۔

۲۔ صوفی مازندرانی نے وطن کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اگرچہ انہیں گجرات میں مظہر کے اشعار کا مسودہ ملا تھا۔

۳۔ مخزن الغرائب میں لکھا ہے کہ مولانا مظہر گجراتی مشہور ہے۔

۴۔ سراج الدین علی خاں آرزو نے اسے گجراتی لکھا ہے اور یہ کہ وہ اصلاً ایرانی تھا۔

۵۔ تقی اوحدی نے جو قریب العہد تذکرہ نگار ہے بیان کیا ہے کہ مظہر کو اکثر جگہ گجراتی لکھا ہے اس نے کچھ تفصیل بھی دی ہے کہ وہ فاضل اور نامور شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ گجرات کے ہندو حکمرانوں کا مداح رہا۔ اس نے شروع میں مظہر کے بیس ہزار اشعار دیکھے۔ اس کے بعد اسے قاضی کرٹہ سے سات آٹھ قصاید کا مسودہ ملا۔ دونوں کا انداز یکساں پایا یعنی وہ مسودہ جو گجرات میں دیکھا اور وہ مسودہ جو قاضی کرٹہ نے فراہم کیا۔

۶۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے مظہر کو کرٹہ کا باشندہ بتایا نیز یہ کہ وہ عالم۔ فاضل اور شاعر کامل تھا۔

۷۔ تذکرۂ گلشن میں قاضی مظہر شہر کرٹہ لکھا ہے۔

۸۔ ڈاکٹر شعیب اعظمی نے کرٹہ کو گجرات کا قصبہ لکھا ہے۔

۹۔ اسرار المجد دین ملفوظ خواجہ کرٹک ابدالؒ میں کرٹہ کو اکثر مقامات پر شہر لکھا ہے جو صوبہ کڑا کا صدر مقام تھا۔ یہ ملفوظ عہد تغلق میں ۷۸۱ھ میں تالیف ہوا تھا۔ اس کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شہر کے تین جانب حفاظت کے لیے حصار تھا اور چوتھی یعنی جانب مشرق دریا ہے۔

مذکورہ بالا اقوال کے مطابق وہ کرٹہ جو گجرات میں ہے ایک قصبہ تھا اور گجرات ہندو ریاست تھی۔ شہر اور قصبہ میں بین فرق ہوتا ہے۔ دوسرا کڑا الہ آباد سے ساٹھ کلومیٹر مغرب

دریائے گنگا کے کنارے آباد تھا غیر مسلم ریاست اور مسلم صوبہ کا صدر مقام رہا، اس مقام کی قدامت اور مذہبی اہمیت کے پیش نظر ریاست کا نام بھی اسی جگہ کے نام سے ریاست کڑا معروف ہوا۔ قدیم دور میں اس کا نام جانھنوی شیتر یا چھیتر لکھا ہے اور اسلامی دور میں لقب عاشق آباد تھا۔ کڑا نام کیسے ہوا اس کی تین وجوہات تاریخ میں بتائی گئی ہیں لیکن اس سے پہلے اس کی قدامت کا ذکر ضروری ہے۔

گنگا ہندوؤں کا مقدس ترین دریا مانا جاتا ہے اور ان کے عقاید کے مطابق جب یہ پہاڑ سے چلی تو پہلے ان کے بھگوان شنکر یا مہا دیو کے بالوں میں الجھی رہی اور پھر اس کے بعد زمین پر آئی۔ گنگا کی یہ آمد راجہ بھاگی رت کی عبادت اور ریاضت کا نتیجہ تھی۔ جب راجہ گنگا کی رہنمائی کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جسے بعد میں کڑا کا نام ملا تو ایک درویش جہانومل نے بزور کرامت گنگا کا سارا پانی پی لیا عرصہ تک بھاگی رت کی منت سماجت کے بعد اس نے اپنی ران میں شگاف لگا کر گنگا کے پانی کو جاری کیا جسے راجہ لے کر آگے بڑھ گئے۔ اس دن سے یہ مقام مقدس مانا جانے لگا۔ اس مقام پر ایک کندہ تھا جسے ہنود جہانوی کندہ کہتے ہیں، اس کے مغربی حصہ کو بھاگی رتی اور مشرقی حصہ کو جہانوی کنڈ کہا گیا۔ رفتہ رفتہ یہاں آبادی قائم ہوئی اور گنگا کا کنارہ پرستش گاہ بن گیا۔ رشی اور منی یہاں عبادت اور ریاضت کے لیے مقیم ہوئے۔ تقریباً ایک صدی قبل محکمۂ آثار قدیمہ کو یہاں ایک پتھر دستیاب ہوا جس پر نظم اور نثر میں سنسکرت زبان میں عبارت اور اشعار کندہ ہیں۔ یہ پتھر کلکتہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ یہ پتہ نہیں لگتا کہ یہ عبارت کب کندہ ہوئی۔ نثر میں تحریر کا ترجمہ یوں ہے:

"۱۰۹۳ سمبت بکرمی اماوتھ سوری یکم آج شری مدھوکر مہاراج ادھیراج سری

جسپال گنگاجی کے کنارے جس کو جہانوی گھاٹ کہتے ہیں کڑا نام گاؤں ہے آئے۔ جہاں مہا نام جیو سمادہ ساہ جی جسپال اور مدھوکر بکرم ساہ اور ان کے بعد رام نر ساد راجہ گزرے"۔

کندہ اشعار کا ترجمہ۔

"یہ کرکوٹنگ دیوتا کے رہنے کی جگہ ہے، اس دیوتا کی برکت سے نجات ملتی ہے۔ یہ گاؤں نیا آباد ہوا ہے۔ یہ استھان بہت پرانا ہے۔ سال گاؤں جوگیوں کا استھان اور سنبل میں مہادیو جی کا مندر ہے۔ اجودھیا۔ نند گاؤں نجات دہندہ ہیں۔ رنڈکا۔ کڑا۔ کاشی۔ کلکتہ۔ بٹیشر۔ کالنجر۔ مہا کالی نجات دہندہ مقامات ہیں"۔

کرکوٹک ناگ دیوتا کے نام کی مناسبت سے یہ مقام کرایا کڑا مشہور ہوگیا، کڑا نام پڑنے کی یہ پہلی وجہ ہوئی۔

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہاں ایک پتھر حضرت آدمؑ کے وقت سے موجود تھا جسے انتہائی متبرک اور کراماتی مانا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک راجہ کے ہاتھ شل ہوگئے تھے۔ اس نے ازراہ عقیدت اپنے ہاتھوں کو اس پتھر سے مس کیا تو وہ بالکل ٹھیک ہوگئے اور راجہ بے ساختہ چیخ اٹھا، کر آیا، کر آیا، یعنی ہاتھ ٹھیک ہوگیا۔ یہ لفظ شروع میں اس مقام پر عمومی شکل میں معروف ہوا اور رفتہ رفتہ صرف کڑا ہی رہ گیا۔

تیسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ متھرا کے راجہ اوگرسین کے ایک بیٹا کنس اور ایک بیٹی دیوکی تھی۔ نارد منی نے کنس کو بتایا کہ دیوکی کی اولاد اس کی بربادی اور قتل کا باعث ہوگی۔ کنس خوفزدہ ہوا اور مصمم ارادہ کیا کہ وہ اپنی بہن کی کسی اولاد کو زندہ نہ چھوڑے گا، چنانچہ اس نے باپ کو راج گدی سے اتارا اور خود راجہ بن بیٹھا، سب سے پہلے اس نے دیوکی اور اس کے شوہر واسدیو کو قید میں ڈلوا دیا اور اس پر سخت پہرہ مقرر

کر دیا۔ پہرہ داروں کو ہدایت دی کہ جب بھی دیوکی کے یہاں کوئی بچہ ہو اسے اطلاع دی جائے، قید خانہ میں دیوکی کے سات بچے پیدا ہوئے اور کنس نے پیدایش کے فوراً بعد قتل کر دیے، یہ سب لڑکیاں تھیں۔ آٹھویں ولادت سے قبل دونوں نے غیبی آواز سنی جو کہہ رہی تھی کہ جو بچہ پیدا ہو اسے فوراً نند گاؤں میں نند اگوپ کے مکان پر لے جائے اس کی بیوی یسودھا کے یہاں پیدا ہوئی بچی کو لائے اور اپنے بچے کو وہاں لٹا دے آٹھواں بچہ لڑکا پیدا ہوا جو انتہائی خوبصورت تھا۔ اسی وقت قید خانہ کے دروازے خود بخود کھل گئے۔ واسدیو اس بچہ کو لے کر چلے۔ نند گاؤں جمنا ندی کے دوسرے کنارے پر آباد تھا۔ واسدیو ندی پار کر کے نند گاؤں نند اگوپ کے مکان پہونچے۔ یسودھا کے پہلو میں اپنا بیٹا لٹا دیا اور اس کی بچی لے کر قید خانہ واپس آگئے' قید خانہ کے دروازے خود بخود بند ہوگئے' صبح پہرہ داروں نے پیدائش کی اطلاع کنس کو دی کنس ننگی تلوار لے کر قید خانہ میں پہونچا۔ بہن کی گود سے بچی کو جھپٹ کر دیوار پر پٹکنا چاہا کہ وہ کنس کے ہاتھ سے پھسل کر ہوا میں اڑ گئی۔ ہندو عقاید کے مطابق وہ کوئی معمولی بچی نہ تھی بلکہ دیوی تھی۔ ہوا میں اڑتی وہ دیوی مشرق کی جانب چلی۔ راستہ میں کئی جگہ اس نے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے۔ یہاں بھی اس نے جس پتھر پر ہاتھ رکھا تھا اس پر نقش ابھر آیا۔ سنسکرت زبان میں ہاتھ کو "کر" کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس جگہ کا نام کرا اور بعد میں کڑا مشہور ہوا۔ جس جگہ یہ واقعہ رونما ہوا تھا ایک پرستش گاہ قایم ہوئی اور وہ پتھر اس میں رکھا گیا۔ یہ عبادت گاہ عرصۂ دراز سے شیتلا دیوی کے مندر کے نام سے مشہور ہے اور ہندی ماہ اساڑھ اور کارتک میں ہر سال میلہ لگتا ہے جہاں زائرین دور دراز کے علاقوں سے آتے ہیں' وہ متبرک پتھر آج بھی اس مندر میں موجود بتایا جاتا ہے۔ جس پر زائرین گنگا کا پانی ڈالتے ہیں۔ یہ مقام

گنگا جی سے تقریباً ایک کلو میٹر مغرب میں ہے اور شیتلن کے نام سے مشہور ہے۔ جو پہلے جہان پور کا حصہ تھا۔

وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو مگر اس کی قدامت میں کوئی شبہ نہیں۔ ہندوؤں کے عقاید کے مطابق گنگا کی تقدیس کے پیش نظر اس کے کنارے آبادی کا ہونا غیر فطری نہیں۔ دوسرے یہ کہ تجارت کے لیے آبی شاہراہوں کی بڑی اہمیت رہی ہے اس لیے سفر کے دوران تاجر جہاں قیام کرتے وہ خود بخود اہمیت کا حامل ہوتا گیا۔ کڑا کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔

راجہ جے چندر کے اجداد نے صدہا سال اس علاقہ میں حکومت کی اور گنگا کے دونوں کناروں پر محکم قلعے تعمیر کرائے جس کے تین جانب گہری نہریں تھیں اور چوتھی جانب گنگا۔ یہ دونوں قلعے بعد میں جے چند اور اس کے بھائی مانک چند کے نام سے مشہور ہوئے جن کے کھنڈرات آج بھی اپنی عظمت رفتہ کو بیان کر رہے ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد پانچویں صدی کے اوائل میں سلطان محمود غزنوی کے بھانجے سالار سید مسعود نے اسے فتح کر کے غزنوی حکومت کا حصہ بنایا اور اس سرزمین کو اسلام اور عربی اور فارسی زبانوں سے روشناس کرایا۔ ان کے رفقا جو یہاں شہید ہوئے ان میں سے چند کی قبریں آج بھی موجود ہیں۔ سید مسعود کی بہرائچ میں شہادت کے بعد یہ ریاست پھر آزاد ہو گئی، اس کے بعد دورہ غوریہ میں شہاب الدین غوری نے راجہ جے چند کو قنوج میں شکست دی اور اس نے فرار ہو کر قلعہ کڑا میں پناہ لی۔ غوریوں کے سالار سید قطب الدین مدنی نے تعاقب کیا اور اسے فرار پر مجبور کیا۔ جے چندر نے گنگا پار کر کے مانک پور کے قلعہ میں پناہ لینا چاہی مگر سید مذکور نے یہاں بھی ٹھہرنے نہ دیا اور جے چند بنارس کی جانب فرار ہو گیا۔ جہاں بعد میں گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ اس طرح

کڑا اور مانک پور کی ریاستیں بھی غوری حکومت کا جز بن گئیں اور سید صاحب ان دونوں صوبوں کے حکمراں ہوئے۔ انہوں نے قلعہ سے ہٹ کر گنگا کے کنارے ہی دوسری عالیشان عمارت تعمیر کرائی۔ وہ جگہ اب ویران ہے مگر قطبی محلہ کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ سید صاحب اپنے عہد کے زبردست عالم، بے مثال سالار، عادل حکمران اور صوفی باصفا تھے۔ انتقال کے بعد یہیں مدفون ہوئے، ان کی چند کرامات کے باعث ہر سال عورتوں کا مزار پر اجتماع ہوتا ہے جسے بی بی کا میلہ کہتے ہیں۔ مزار بلا قید مذہب و ملت زیارت گاہ ہے۔

شہاب الدین غوری نے تمام عمر تجرد میں گذاری۔ غور واپس ہونے سے قبل اپنے عزیز غلام اور معتمد قطب الدین ایبک کو دہلی میں اپنا نائب سلطنت بنایا۔ غور واپس ہوتے ہوئے شہاب الدین قتل کر دیا گیا تو ایک اتفاق رائے سے ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا۔ ایبک کے بعد امرا نے اس کے ایک داماد شمس الدین التمش کو جو شہاب الدین کا غلام اور صوبہ بداؤں کا صوبیدار تھا دہلی کے تخت پر بٹھایا۔ یہ بادشاہ ہوشمند جری عادل اور نامور صوفی شیخ قطب الدین بختیار کاکی کا مرید تھا۔ اسی دور میں چنگیز خاں نے ایران میں قہر برپا کر دیا۔ انسان اور جانور بے دریغ قتل کیے گئے، آبادی ویرانوں میں بدل گئیں۔ کھیتیاں اور کتب خانے نذر آتش کیے گئے۔ چنگیز خاں نے ہندوستان کا بھی رخ کیا۔ ملتان کا ایک ماہ محاصرہ رکھا مگر بے نیل مرام لوٹا۔ پنجاب میں التمش نے شکست دی۔ چنگیز خاں کی سفاکی اور اس کی دہشت و بربریت سے خوف زدہ ہو کر لوگ امن کی تلاش میں دوسرے مقامات کی جانب ہجرت کرنے لگے۔ معتدبہ خاندانوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ اہل علم و فضل کی پذیرائی ہوئی اور اہلیت کے مطابق منصب بھی عطا ہوئے

التمش کے بعد ناصر الدین محمود کے دور میں سادات موسوی۔ نقوی۔ جعفری۔ زیدی اور عسکری وغیرہ مشہد۔ بخارا۔ اصفہان اور ایران کے دوسرے مقامات سے ہجرت کرکے سفر کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے صوبہ کڑا کے صدر مقام شہر کڑا بھی پہونچے ان میں سب سے پہلے سادات موسوی پہونچے جو علم وفضل اور عمل کا پیکر تھے۔ حکمران نے بڑی قدر کی اور مناصب عطا کیے۔ اس کے بعد دوسرے سادات خاندانوں کی بھی پذیرائی ہوئی۔ ان میں بیشتر عالم۔ فاضل شاعر۔ نثر نگار اور صوفی تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کڑا علم اور تصوف کا بڑا مرکز بن گیا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ عہد مملوکیہ کے بعد خلجی دور آیا۔ جس زمانہ میں علاء الدین خلجی صوبہ کڑا کا صوبہ دار تھا، یہاں ایک بڑے اہم شخص موجود تھے جو اپنے عہد کے جید عالم اور بلند پایہ صوفی اور بے مثال شاعر بھی تھے ان پر بیشتر جذب کی حالت طاری رہتی اور برہنہ رہتے، ان کا نام نامی اور اسم گرامی سید احمد المعروف بہ خواجہ کڑک تھا۔ ان کے ملفوظات کے جو ۷۱۱ھ میں تالیف ہوئے، مطالعہ سے کڑا کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس عہد میں بھی علم کو فروغ ہوا۔ خلجی عہد کے بعد تغلق دور آیا۔ الغ خاں جو بعد میں محمد تغلق کے نام سے عہد تغلق کا دوسرا بادشاہ ہوا، باپ کی زندگی میں کڑا کا صوبہ دار تھا۔

اب مظہر کے اس شعر پر کڑا کے علمی اور ادبی ماحول اور خانوادہ سادات کے مجمع کو ذہن میں رکھتے ہوئے نظر ڈالیں اور پھر اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں قیاس کریں۔

مرا خویش و فرزند و خیل و تبار　　فزون از ہزار اند اگر بشمری

مظہر نے جو قصیدہ ۷۸۹ھ میں لکھا تھا اس کے اس شعر میں اپنی عمر بھی بتائی ہے۔

من چو دیدم این کہ چوں ہفتاد و سہ گذشت　　عمر و فلک بر آنیست کہ پشتم دو تا کند

اس حساب سے اس کی پیدائش ۷۱۶ھ میں ہوئی اور اسی سال علاء الدین خلجی کا انتقال ہوا۔ ۷۲۰ھ سے تغلق دور کا آغاز ہوتا ہے۔ محمد تغلق کا دور ۷۲۶ھ اور فیروز تغلق کا دور ۷۵۲ھ سے شروع ہوا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مظہر تغلق عہد میں پروان چڑھا۔ پیدائش کے بعد جب تعلیم کا آغاز ہوا تو اسے اعلیٰ پیمانہ کا دینی، علمی اور ادبی ماحول ملا اور اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ چونکہ شعر و شاعری کا بھی زور تھا اور مظہر کو یقیناً فطری ذوق تھا اس لیے اس نے اس ماحول سے بخوبی استفادہ کیا۔ مظہر کو اپنی اعلیٰ النسبی پر ناز تھا۔ کہتا ہے :

آنکہ دارد حسبی تازہ تر از سرو چمن　　وانکہ دارد نسبی پاک تر از ماظہور

اپنے علم وفضل اور نثر نگاری پر بھی ناز تھا جس کے لیے اس کا یہ شعر کافی ہے۔

در علم وفضل نیست چو من مفتی و حکیم　　در نظم و نثر نیست چو من شاعر و دبیر

یہ علم وفضل اور نظم و نثر میں بلند پائیگی اسی وقت عقلاً ممکن ہے جب خود کے خانوادہ کے علاوہ چاروں طرف ایسا ماحول ہو جو شہر کڑا میں اس کے تعلیمی دور میں حاصل تھا۔

حصول تعلیم کے بعد اسے فکر معاش بھی ہوئی ہوگی اور بہتر مقام کی تلاش کی فکر میں بھی رہا ہوگا، چنانچہ سب سے پہلے وہ پایہ تخت دہلی گیا ہوگا تاکہ محمد تغلق کے دربار میں رسائی حاصل کر سکے مگر یہ ممکن نہ ہو سکا کیونکہ محمد تغلق کو تخت نشینی کے بعد دہلی سے دولت آباد میں پایہ تخت کی تبدیلی میں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کام میں علما سب سے آگے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھر دہلی واپس آگیا مگر اس سے

وہ ایسے ذہنی خلفشار میں مبتلا ہوا کہ اخیر وقت تک قائم رہا۔ مظہر کے دہلی جانے کی اہم وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ محمد تغلق بادشاہ ہونے سے قبل صوبہ کڑا کا صوبہ دار تھا۔ وہاں سادات کڑا کے علما و فضلا سے ربط ہونا لازمی تھا کیونکہ حکومت کے اعلیٰ مناصب پر وہی متمکن تھے اور مذکورہ بالا شعر کے مطابق وہ بھی خاندان سادات کا فرد تھا جب اسے دہلی میں ناکامی ہوئی تو وہ ایران چلا گیا مگر وطن اور خاندان والوں کی طویل جدائی برداشت نہ کر سکا اس لیے واپس ہندوستان ہوا اور ریاست گجرات کے قصبہ کڑا میں عارضی طور پر مقیم ہوا۔ والیان ریاست کی مدح میں قصاید بھی لکھے۔ یہاں اس نے طویل عرصہ گذارا اور فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دہلی پہونچا اور اس کے دربار میں رسائی حاصل کر لی اور تادم اخیر دہلی میں ہی مقیم رہا۔ اسی زمانہ میں اس نے شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کی جو شیخ نظام الدین دہلوی کے مرید و خلیفہ تھے ارادت میں شامل ہو گئے۔

شہر کڑہ صدر مقام صوبہ کڑا اور وہاں کی دینی، علمی اور ادبی سرگرمیوں کا یہ مختصر خاکہ تھا اس کی روشنی میں تذکرہ نگاروں کے اس قول کا تجزیہ کیا جائے جس میں اسے گجراتی اور قصبہ کڑا کا باشندہ بتایا گیا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ گجرات ایک غیر مسلم ریاست تھی جس کے قصبہ میں ایسے علمی اور ادبی ماحول کی گنجایش سمجھ میں نہیں آتی جو مظہر کے ان اشعار کی تصدیق کر سکے جس میں اس نے اپنی علمیت کے بارے میں اور حسب نسب ذکر کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک غیر مسلم ریاست کے قصبہ میں قاضی کا عہدہ ہونا بھی بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ مسلم صوبوں میں قاضی کا عہدہ شہر میں ہوتا ہے جس کے تابع قصبے بھی ہوتے ہیں۔ مظہر کے اشعار اس کڑا کے علمی اور ادبی ماحول کی غمازی کرتے ہیں جو دریائے گنگا کے کنارے آباد ہے۔ پہلے یہ تحریر میں آچکا ہے کہ سادات موسوی سب سے پہلے وہاں

پہونچے تھے اور وہاں اس خاندان کے ایک فرد کو قاضی شہر مقرر کیا گیا تھا جو علم کے باعث اسی خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ قائم رہا یہاں تک کہ دور مغلیہ کے آخر تک قاضی کا عہدہ سادات موسوی کے ہی سپرد رہا۔ آج بھی اس خاندان کے افراد اپنے نام کے ساتھ لفظ قاضی کا استعمال کرتے ہیں، تقی اوحدی کو جس قاضی کڑا سے مظہر کے قصاید کا مسودہ ملا تھا وہ یقیناً یہی شہر کڑا تھا، جہاں تک حسب نسب کا تعلق ہے مظہر سادات موسوی کے ایک خاندان کا فرد تھا جہاں علم، ادب اور تصوف جزو زندگی تھا۔

ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ چونکہ مظہر عرصہ دراز تک گجرات کے کڑا میں رہا اس لیے اشتباہاً گجراتی لکھا گیا کیونکہ کسی نے بھی اس کڑا کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ اصلاً ایرانی تھا کیونکہ سادات ایران سے ہجرت کر کے کڑا آئے تھے جو شہر تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مظہر خاندان سادات موسوی کا فرد تھا جو علم و ادب میں یگانۂ روزگار اور ایران سے ہجرت کر کے آیا تھا۔

بزم مملوکیہ

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم

ہندوستان کے عہد اسلامی میں سلاطین دہلی کا دور عظمت و سطوت علم دوستی اور علماء نوازی میں نمایاں ہے انکے درباروں میں بڑے بڑے علماء و فضلاء ادباء شعراء اور مختلف فنون کے اصحاب علم و کمال کا اجتماع تھا علمی حیثیت سے انکا یہ دور بہت ممتاز ہے مگر اردو میں اسکے متعلق معلومات بہت کم تھیں اس کمی کو اس کتاب میں بڑی خوبی اور تحقیق و جستجو سے پورا کیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ ہمارے ان قابل فخر اسلاف کے کمالات کی بدولت ہمارے موجودہ ذوق کی نشو و نما ہوئی۔

قیمت ...۔۔ ۴۰ "منیجر"

اقبال کے کلام میں "خبر" و "نظر" کی اصطلاحیں

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب پٹنہ

اقبال کے کلام میں الفاظ سے مشتق اصطلاحوں کا ایک ڈھیر ہے جنہیں انہوں نے ایمان و یقین کے نکتوں کو ذہن نشین کرانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ ایسی ہی دو اصطلاحیں "خبر" و "نظر" ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اقبال کے فلسفہ میں "خبر" کا سرمایہ تمام تر وہ معلومات ہیں جو حواس خمسہ سے حاصل ہوتی ہیں اور "نظر" کا سرمایہ یقین ہے جو صرف عشق کی بدولت حاصل ہے اور جس کا سرچشمہ دل ہے، اقبال نے "نظر" کی اصطلاح عشق ہی کی عشوہ طرازیوں کے باب استعمال کی ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا کی محبت "شنید" نہیں "دید" ہے، یعنی وہی شخص خدا سے محبت کر سکتا ہے جو خدا کے حسن کا ذاتی احساس رکھتا ہو، اقبال اسی لیے "شنید" کے لیے "خبر" اور "دید" کے لیے "نظر" کی اصطلاحات لاتے ہیں۔

یہ کہ "خبر" عقل کی بدولت وجود میں آتی ہے اور "نظر" عشق کی عشوہ طرازیوں کا ماحصل ہے، اس فرق کو اقبال نے "بال جبریل" کی غزل ۲۴ کے درج ذیل شعر میں واضح کیا ہے ؎

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں ۔۔۔ ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

مطلب یہ کہ عقل کا منتہائے پرواز اس سے زیادہ نہیں کہ نظام عالم اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کا کوئی خالق یا کم از کم صانع ہونا چاہیے مگر عقل کی سرحد یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ مگر عشق کہتا ہے کہ ہاں اس کائنات کا ایک خالق ہے اور یہ صرف میرے اتباع سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ عقل کی رسائی حریم ناز کے دروازہ تک ہے لیکن عشق پردہ ہٹا کر داخل ہو جاتا ہے۔ یعنی اسے حضوری حاصل ہو جاتی ہے یہ بات عقل کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ حضوری عقل کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے۔ اسی نکتہ کو اقبال نے "بال جبریل" کی غزل ۲۰ کے درج ذیل شعر میں باور کرایا ہے ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں ۔۔۔ اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اقبال جب "نظر" کی اصطلاح لاتے ہیں تو وہ بلا واسطہ قرآن مجید کے اس فقرہ "اَلَمْ تَرَ" (کیا تو نے دیکھا نہیں؟) کی ماہیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ الفاظ قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر آئے ہیں جیسے سورۃ ابراہیم ۱۴ کی آیت ۱۹، سورۃ الحج ۲۲ کی آیات ۱۸ اور ۶۵، سورۃ النور ۲۴ کی آیت ۴۳، سورۃ لقمٰن ۳۱ کی آیات ۲۹ اور ۳۱، سورۃ فاطر ۳۵ کی آیت ۲۷، سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۲۱ اور سورۃ الفیل ۱۰۵ کی آیت ۱ میں جہاں یہ ساری آیات "اَلَمْ تَرَ" سے شروع ہوتی ہیں۔ ہر آیت میں ان الفاظ سے مضمون شروع کرنے کا مقصود خدائے تعالیٰ کا صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کو مخاطب کر کے خدا کی ساری تخلیقات کو، جو اس کائنات میں ظہور پذیر ہیں بہ نظر غور دیکھ کر اللہ کی ہستی پر یقین کامل پیدا کرنا اور ان سے سبق حاصل کرنا ہے۔ اس "نظر" کی اصطلاح کو سرگزشت لانے کے لیے ان ساری متذکرہ بالا آیات کا جو "اَلَمْ تَرَ" سے شروع ہوتی ہیں مطالعہ ضروری ہے کیونکہ

یہ آیات یہ باور کرانے کے لیے کافی ہیں کہ اقبال اسی "نظر" کو پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں جو خدا کا "اَلَمْ تَرَ" سے مخاطب کر کے انسانوں کو باور کراتا ہے

"خبر" اور "نظر" کے فرق کو اقبال نے "ارمغان حجاز" کی درج ذیل رباعی میں واضح کیا ہے:-

خبر، عقل و خرد کی ناتوانی — نظر، دل کی حیات جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز — سزاوار حدیث لن ترانی

پھر اقبال اسی فرق پر "بال جبریل" کی غزل ۵۹ کے درج ذیل شعر میں روشنی ڈالتے ہوئے فقر کو "مقام نظر" اور علم کو "مقام خبر" سے تعبیر کرتے ہیں ؎

فقر مقام نظر، علم مقام خبر — فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ

فقر طریقت کی ایک اصطلاح ہے جسے اقبال نے قطعی الگ معنوں میں استعمال کیا ہے کیونکہ وہ خود صوفیانہ طریقہ کار کے من و عن قائل نہ تھے۔ اقبال کے مطابق شریعت کو پرکھنے اور بہ نظر عمیق عمل کرنے کا نام ہی طریقت ہے۔ اقبال کے فکری نظام میں فقر بنیادی اہمیت کا حامل ہے، جس کے ڈانڈے عشق سے جا ملتے ہیں اور جہاں عشق اور خودی کے تصورات باہم شیر و شکر نظر آتے ہیں۔ اقبال فقر د استغنا سے بے نیازی مراد لیتے ہیں جسے مادی وسائل کی موجودگی یا غیر موجودگی کا خیال تک نہ ہو۔ اقبال کا ایسا فقیر مادی وسائل حاصل کرنے یا ان کی حفاظت کرنے کے لیے اعلیٰ قدروں کو قربان نہیں کرتا۔ فقر، ان کے نزدیک، روح اسلام کے مترادف ہے۔

متذکرہ بالا شعر میں اقبال "نظر" کا جو مقام متعین کرتے ہیں وہ صرف "شان فقر"

کی بدولت حاصل ہوتا ہے اور جس کی بدولت انسان کو حقیقت کی آگہی ممکن ہے کیونکہ علم انسان کو نہ اس آگہی کے مقام تک پہنچا سکتا ہے اور نہ حقیقت پژوہی میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ یہ بسا اوقات گمراہی کا باعث بن جاتا ہے۔ اسی نکتہ پر "بال جبریل" کی غزل ۵۷ میں اقبال کا یہ شعر بھی ہے ؎

ایک سر مستی و حیرت ہے سراپا تاریک — ایک سر مستی و حیرت ہے تمام آگاہی

علم اور عشق دونوں کا نتیجہ سر مستی و حیرت ہے لیکن جو حیرت علم یا فلسفہ سے پیدا ہوتی ہے وہ سراپا تاریک ہوتی ہے مگر جو حیرت یعنی حقیقت کی آگہی عشق سے پیدا ہوتی ہے وہ سراسر آگاہی ہوتی اور اس سے عاشق یعنی "صاحب فقر" کو اللہ کی ہستی پر کامل یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک علم اور عشق میں وہی فرق ہے جو شنیدن اور دیدن میں ہے اسی لیے عقلاء کہتے ہیں: "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔ جس پر انگریزی میں یہ مقولہ ہے "SEEING IS BELIEVING" اقبال نے علم و عشق کے اس فرق کو انہی معنوں میں تفصیلی طور پر "ضرب کلیم" کی نظم "علم و عشق" میں واضح کیا ہے، جس کے دو بندوں کے ٹیپ کے اشعار یہ ہیں:

(۱) عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب
(۲) علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

اس "شنیدن" اور "دیدن" کے موضوع پر ایک روایت ہے کہ ایک دن حکیم بو علی سینا حضرت سلطان ابو سعید ابو الخیرؒ کی خدمت میں آئے اور ان کو اپنی مشہور کتاب "اشارات" کا وہ حصہ پڑھ کر سنایا جس میں انہوں نے خدا کی ہستی کا عقلی دلائل سے اثبات کیا تھا جب وہ چلے گئے تو حضرت سلطان نے اپنے مریدوں سے ارشاد فرمایا: "آنچہ او می داند ما می بینیم"۔ یعنی دیکھنے کے بعد جو مستی و حیرت پیدا ہوتی ہے وہ تمام آگاہی ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں فیضان نظر کے بہت سے واقعے بیان فرمائے گئے ہیں۔ اسی پس منظر
میں اقبال نے ایک موقع پر "نظر" کو "چشم جہاں بیں" سے موسوم کرتے ہوئے اس کی
عشوہ طرازیوں کا اطلاق حضرت ابراہیمؑ کے ایمان سے یقین کی منزل تک پہنچنے پر "بانگ درا"
کی نظم "خضر راہ" کی ذیلی نظم "صحرا نوردی" کے اس شعر میں کیا ہے ؎

وہ سکوتِ شام صحرا میں غروب آفتاب — جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

یہ کہ حضرت ابراہیم ایمان کی دولت سے سرشار تھے مگر خدا کی وحدانیت پر انہیں
یقین کامل کی ضرورت تھی، چنانچہ خدائے تعالیٰ کا خود ارشاد ہے:

"ابراہیم کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اسلئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین
کرنے والوں میں ہو جائے"۔ (سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۷۵)

ایمان کی اصل روح اعتماد کرنا ہے جو صرف جہاں بینی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ اعتماد
ایک ایسی ہستی کے بارے میں ہوتا ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے
اس میں یقین کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ ایمان اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خدا اور
اس کے رسول پر اس کلی اعتماد کا نام ہے جو یقین کامل سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ یقین جو
ایمان کا پہلا جزو ہے خارج سے درآمد کی ہوئی کسی چیز کا نام نہیں بلکہ اس حقیقت
کا زندہ شعور ہے جو خود انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی ہے۔ مگر یقین کی یہ کیفیت
کسی کو خود بخود حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ انسان کھلی
آنکھوں سے اس کی تلاش میں اپنے کو گم کر چکا ہو۔ ایسا ہی کچھ حضرت ابراہیمؑ کو یقین
کی منزل تک پہنچنے میں ہوا۔ چنانچہ جیسا سورۃ الانعام ۶ کی آیات ۷۶ تا ۷۸ میں مذکور
ہے حضرت ابراہیم نے اپنی کھلی آنکھوں سے پہلے تارا، پھر چاند اور پھر سورج کو اپنا رب

قرار دیا مگر جب سورج کو بھی غروب ہوتے دیکھا تو وہ چونکہ یقین کی منزل تک پہنچ
چکے تھے اس لیے انھوں نے ان سب کو رب ماننے سے انکار کیا اور یکبارگی آپ
کی زبان مبارک سے سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۷۹، کے وہ کلمات صادر ہوئے جسے
ساری دنیائے اسلام ہزاروں سال سے ہر نماز میں نیت باندھنے کے قبل ورد
کرتی آرہی ہے، جو کلمات کہ خدا کے وحدہ لاشریک ہونے پر یقین کی آخری منزل ہے
اقبال ایسی ہی نظر کو "براہیمی نظر" کا نام دیتے ہوئے "بانگ درا" کی نظم "طلوع اسلام"
کے پانچویں بند میں کہتے ہیں ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے — ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

اقبال جس "نظر" کی دعوت دیتے ہیں وہ باطنی یعنی دل کی نگاہ ہے جو صرف فقر
سے پیدا ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اقبال کے ذہن میں حضرت ابراہیم کے یقین کامل تک
پہنچنے کا متذکرہ بالا واقعہ رہا ہو جس نے ان سے "ضرب کلیم" کی نظم "محراب گل
افغان کے افکار" کے انیسویں بند میں یہ شعر کہلوایا ؎

نگاہ وہ نہیں جو سرخ و زرد پہچانے — نگاہ وہ ہے کہ محتاج مہر و ماہ نہیں

اقبال نے فیضان نظر کی دوسری مثال حضرت اسمٰعیلؑ کا اپنے والد حضرت
ابراہیمؑ کے خواب کو سچ کر دکھانے کے لیے اپنے کو قربان کر دینے پر آمادگی کی (دیکھیں
سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷۔ رکوع ۳) "بال جبریل" کی غزل ۱۰ (اول) کے اس شعر میں دی ہے ؎

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی — سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

حضرت اسمٰعیلؑ کے اندر شیوۂ تسلیم و رضا صرف حضرت ابراہیمؑ کی صحبت سے پیدا
ہوا تھا۔ طریقت میں صحبت اور نظر ایک ہی چیز ہیں اور اس کے بغیر تزکیۂ نفس نہیں

ہو سکتا۔ اس لیے تمام بزرگان دین نے صحبت مرشد کو تکمیل دین یا حصول مرتبہ کے لیے لازمی اور ضروری قرار دیا ہے اور اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں صحبت مرشد کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔

اقبال نے "خبر" اور "نظر" کے فرق کو اپنے مجموعۂ کلام "ارمغان حجاز" کی نظم "تصویر و مصور" میں "تصویر" اور "مصور" کے مابین مکالمہ کے طور پر ذہن نشین کرایا ہے۔ تصویر مصور سے کہتی ہے:

کہا تصویر نے تصویر گر سے　　　نمایش ہے مری تیرے ہنر سے
ولیکن کس قدر نا منصفی ہے　　　کہ تو پوشیدہ ہو میری نظر سے

تو مصور نے جواب دیا:

گراں ہے چشم بینا دیدہ ور پر　　　جہاں بینی سے کیا گزری شرر پر
نظر درد و غم و سوز و تب و تاب　　　تو اے ناداں قناعت کر خبر پر

چنانچہ "بانگ درا" کی نظم "طلوعِ اسلام" کے دوسرے بند میں اس جہاں بینی کی صفت پیدا کرنے کی تلقین اس طرح کرتے ہیں ؎

جہانبانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی　　　جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

اقبال نے اپنے کلام میں اسی "نظر" کے لیے کہیں "چشم بینا"، کہیں "چشم دل" کہیں "دل بینا" اور کہیں "چشم جہاں بیں" کی تراکیب لائی ہیں اور ان سب کا جواز انہوں نے سورۃ الحج ۲۲ کی درج ذیل آیت ۴۶ سے فراہم کیا ہے۔ فرمایا گیا:۔

"حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں"۔

اقبال نے "خبر" اور "نظر" کے فرق اور ان کی ماہیت کی وضاحت اپنے کلام میں اپنے پیر و مرشد رومی سے بھی کرائی ہے۔ "بال جبریل" کی نظم "پیر و مرید" میں انہوں نے اپنے مرشد سے چوبیس موضوعات پر چوبیس سوالات کیے جس میں نواں سوال وہ یہ دریافت کرتے ہیں ؎

خاک تیرے نور سے روشن بصر　　　غایت آدم خبر ہے یا نظر؟

سوال یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو کس لیے پیدا کیا ہے؟ عقل میں ترقی کر کے فلسفی بننے کے لیے یا عشق میں ترقی کر کے عارف بننے کے لیے؟ تو پیر درج ذیل شعر میں یہ جواب دیتے ہیں کہ آدمی کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اندر ایسی قوت پیدا کرے کہ اسے محبوب حقیقی کا دیدار ہو سکے۔ رومی جواب دیتے ہیں ؎

آدمی دیداست، باقی پوست است　　　دید آں باشد کہ دید دوست است

"خبر" اور "نظر" پر "بال جبریل" کی نظم "ہسپانیہ" میں اقبال کا یہ شعر بھی ہے ؎

دیکھا بھی دکھایا بھی، سنایا بھی سنا بھی
ہے دل کو تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

"خبر" سے اقبال نے ایک اصطلاح "بے خبری" بھی وضع کی ہے جس سے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "ارمغان حجاز" کی نظم "ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" کے گیارھویں بند میں ہے ؎

طلسم بے خبری، کافری و دینداری　　　حدیث شیخ و برہمن فسون و افسانہ

اقبال نے "نظر" سے ایک اصطلاح "صاحب نظر" بھی وضع کی ہے جس سے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بال جبریل" کی نظم "فلسفہ و مذہب" میں ہے:۔

کھلتا نہیں مرے سفر زندگی کا راز — لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں
حیراں ہے بو علی کہ میں آیا کہاں سے ہوں — رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

اقبال نے اسی حقیقت کو "بال جبریل" کی غزل ۳۳ کے اس شعر میں اس طرح فرمایا ہے جو رومی سے مطابقت رکھتا ہے ؎

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے ؛ کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

اقبال بو علی سینا کے معترف نہ تھے اس لیے کہ وہ عقل کی مدد سے حقیقت کو جاننا چاہتے تھے۔ اس لیے ایسے فلسفیوں کے لیے جو عقل سے یہ کام لیتے ہیں اقبال "خرد مندوں" کا لفظ لاتے ہیں اور بو علی سینا کو اس لیے حیران بتاتے ہیں، کیونکہ وہ "دید" (نظر) کی نہیں "شنید" (خبر) کی بات کرتے ہیں اور تشکیک کا شکار ہو جاتے ہیں مگر رومی سا "صاحب نظر" جو دل سے اس حقیقت کو جانتا ہے وہ صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ فلسفی اس ادھیڑ بن میں رہتے ہیں کہ میری ابتدا کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ جان کر کیا ہوگا میں تو موجود ہوں ہی، جاننا تو یہ ہے کہ میری انتہا کیا ہوگی یعنی عقبیٰ اور آخرت کی فکر۔ اس لیے رومی جو "صاحب نظر" ہیں سوچتے ہیں کہ کون سا راستہ اختیار کروں کہ میری عقبیٰ سنور جائے۔

انٹرنس کورس فارسی مرتبہ علامہ شبلیؒ

(۱)

از
ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب۔ بریلی

علامہ شبلی کی علمی و ادبی خدمات سے دنیا واقف ہے لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انہوں نے سنڈیکیٹ برائے امتحان فارسی الہ آباد یونیورسٹی کی تجویز پر فارسی کورس بھی تیار کیا تھا جس کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی نے محمد مہدی نائب مہتمم صیغۂ تاریخ بھوپال کے حوالے سے حیات شبلی میں تحریر کیا ہے:

"الہ آباد یونیورسٹی کے قیام کے وقت ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں فارسی کورس نہایت آسان بنایا گیا تھا۔ ایک عرصہ تک جب طلبہ آسانی کے ساتھ اس میں کامیاب ہوتے رہے تو یونیورسٹی کے ایک گروہ نے فارسی کورس کے آسان ہونے کی شکایت کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی یونیورسٹی کی تعلیم میں ایک مضمون ہونے کے ناقابل سمجھی گئی لیکن عین وقت پر مولانا نے نہایت قابلیت سے ایک کورس تیار کیا جس کا معیار اس قدر بلند تھا کہ فارسی کا وقار قائم رہ گیا اور اس کا اخراج ملتوی ہوگیا۔" (ص ۲۶۴)

علامہ سید سلیمان ندوی کی مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلیؒ نے ایف اے اور بی اے کا فارسی کورس تیار کیا تھا اور انٹرنس کورس فارسی محمد مہدی

نائب مہتمم صیغہ تاریخ بھوپال کے علم میں نہیں تھا ورنہ وہ انٹرنس کورس فارسی کا بھی ذکر کرتے۔ ظن قوی یہی ہے کہ علامہ شبلی نے ایف اے اور بی اے کے کورس کے ساتھ ہی انٹرنس کورس فارسی بھی تیار کیا ہوگا۔ مجھے کوشش کے باوجود ایف اے اور بی اے کا مذکورہ فارسی دستیاب نہیں ہوا لیکن انٹرنس کورس فارسی (طبع پنجم) ضرور فراہم ہوگیا جس کو متعارف کرانا اس وجہ سے اہم معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کی اس خدمت سے بھی دنیا واقف ہوجائے۔

علامہ شبلی کا مرتب کردہ انٹرنس کورس فارسی مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا تھا۔ صفحات کی تعداد ۲۲۴ ہے۔ ورق کا سائز "۹ × ۶" ہے۔ کتابت اور طباعت نہایت عمدہ ہے۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے:

"انٹرنس کورس فارسی مجوزہ سنڈیکیٹ برائے امتحان انٹرنس الہ آباد یونیورسٹی مرتبہ جناب مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی المخاطب بہ شمس العلما سابق پروفیسر مدرستہ العلوم علی گڑھ و فیلو آف یونیورسٹی الہ آباد۔ در مطبع فیض عام واقع علی گڑھ مطبوع طبائع گردید" طبع پنجم ۵۰۰ جلد

کتاب کے آخر میں ایک اشتہار اس مضمون کا ہے:

"حسب منشاء قانون بستم ۱۸۶۷ء جملہ حقوق ایں کتاب محفوظ است البتہ بابو اننت رام بہار گو بی اے و بابو رام ناتھ بہار گو بی اے ساکنان الہ آباد محلہ یحییٰ پور اجازت ترجمہ اردو و انگریزی از مولف حاصل کردہ اند ہر کسی را کہ ترجمہ اردو یا انگریزی درکار باشد از بابو صاحبان موصوف طلب تواند کرد۔"

المشتہر۔ شبلی نعمانی پروفیسر مدرستہ العلوم علی گڑھ۔

اس کتاب میں نہ ابتدائیہ ہے اور نہ تتمہ۔ تاریخ طباعت بھی نہیں ہے۔ اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ انٹرنس کورس فارسی طبع اول کے وقت علامہ شبلی مدرستہ العلوم علی گڑھ میں پروفیسر تھے لیکن سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبع پنجم کے وقت مدرستہ العلوم علی گڑھ میں پروفیسر نہیں تھے۔ ان حقائق کے پیش نظر انٹرنس کورس فارسی طبع اول اور طبع پنجم کی سنین کا دریافت کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی کی موقر تالیف حیات شبلی سے رجوع کرنے کے بعد مستفاد ہوا کہ الہ آباد یونیورسٹی نے مولانا شبلی کو ۱۸۹۵ء میں اپنی فیکلٹی آف آرٹس (شعبۂ فنون) اور بورڈ آف اسٹڈی (شعبۂ تدریس) کا ممبر بنایا اور وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔ انہوں نے اسی سال ایک مطول یادداشت کورسوں کے متعلق تیار کی اور فارسی کورس تیار کیا۔ (ص ۲۶۴) اس وقت مولانا شبلی مدرستہ العلوم علی گڑھ میں پروفیسر تھے کیونکہ وہ جون ۱۸۹۸ء میں ملازمت سے الگ ہو کر اعظم گڈھ چلے آئے تھے (ص ۳۲۲) علامہ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ "مولانا جب تک کالج میں رہے سو روپے سال اس کی آمدنی سے کالج کو دیتے رہے" (ص ۲۶۵) اس اطلاع سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے جون ۱۸۹۸ء میں کالج کی ملازمت سے علیحدہ ہونے سے قبل کورس کی آمدنی سے چند بار سو روپے سال کالج کو دیے تھے۔ لہٰذا ان امور کے پیش نظر یہ بات قرین قیاس ہے کہ فارسی کورس جو انہوں نے ۱۸۹۵ء میں تیار کیا تھا، وہ الہ آباد یونیورسٹی کی منظوری کے مرحلے سے گزرنے کے بعد ۱۸۹۶ء میں طبع ہوا ہوگا۔ جہاں تک طبع پنجم کی سن طباعت کا تعلق ہے تو اس مفروضے پر کہ وہ ہر سال طبع ہوا اور عثمان علی نیاز علی رضا بیگ جنھوں نے کتابت کی تھی، ان کی مارچ ۱۹۰۰ء کی مندرجہ تاریخوں کی روشنی میں جو کئے

جگہ حاشیوں پر موجود ہیں، یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کی طباعت ۱۹۰۰ء میں ہوئی ہوگی۔ اگر یہ مفروضہ اور قیاس درست ہے تو طبع اول ۱۸۹۶ء میں ہی ہونا چاہیے۔

بہرنوع اس امر میں شبہ نہیں کہ علامہ شبلی نے الٰہ آباد یونیورسٹی کے لیے انٹرنس ایف اے اور بی اے کا فارسی کورس ۱۸۹۵ء اور جون ۱۸۹۸ء کی درمیانی مدت میں تیار کرکے طبع کرایا تھا اور ۱۸۹۶ء کو طبع اول کا سال قیاساً قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کورس مقبول ہوا اور سالہا سال تک چلتا رہا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں تحریر کیا ہے:

"یہ کورس سالہا سال تک شاید ۱۹۰۳ء تک یا اس کے بعد تک چلتا رہا۔" (ص ۲۶۵)

دراصل انٹرنس کورس فارسی کے ۱۹۱۰ء تک چلنے کی شہادت تو زیر نظر کتاب سے ہی مل جاتی ہے۔ اس کتاب کے صفحات پر جس طالب علم (سید عابد مہدی۔ زمیندار۔ وکیل فوجداری بریلی متوفی ۱۹۵۳ء) نے اپنا نام درج کیا، وہ معروف فرد تھے اور تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ انہوں نے انٹرنس کا امتحان ۱۹۱۰ء میں پاس کیا تھا۔ شاید یہ کورس ۱۹۱۰ء کے بعد تک چلتا رہا۔

انٹرنس کورس فارسی میں دیباچہ نہ ہونے کی وجہ سے ان بنیادی امور کا علم نہیں ہوتا جو انتخاب کلام نظم و نثر کے وقت علامہ شبلی کے ذہن میں تھے۔ مزید برآں ان تجاویز کا بھی علم نہیں ہوا جو سنڈیکیٹ برائے امتحان انٹرنس الہ آباد یونیورسٹی نے کورس تیار کرنے کے لیے مولف کو پیش کی تھیں۔ البتہ علامہ سید سلیمان ندوی نے ایف اے اور بی اے کورس پر روشنی ڈالتے ہوئے جو نکات حیات شبلی میں درج کیے ہیں، وہ انٹرنس کورس فارسی پر بھی صادق آتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

"اس کورس کی نثر میں چند باتوں کا خیال رکھا گیا ہے، ایک تو یہ کہ وہ خالص فارسی

ہو، دوسرے یہ کہ وہ روزمرہ کی باتوں کی تحریر کا سلیقہ سکھائے اور تیسری یہ کہ اس سے مسلمانوں کے آئین حکومت اور تمدن کا نقشہ کھنچ جائے اور ایک متقدم اور ایک متاخر نثر دونوں کا نمونہ پیش ہو جائے۔" (ص ۲۶۵)

اب انٹرنس کورس فارسی کے انتخاب نثر (ص ۱ تا ص ۹۶) کے مشمولات کا مطالعہ کرنے کے بعد سب سے پہلے سعدی شیرازی کی گلستاں باب چہارم (در فوائد خاموشی) اور باب ہشتم (در آداب صحبت) کا انتخاب ملتا ہے۔ ظاہر ہے یہ انتخاب خالص فارسی میں پند و موعظت کا نمونہ ہے جو مسلمانوں کی معاشرتی روایات کے مطابق بھی ہے۔ اس کے بعد سفرنامہ خسرو کا انتخاب ہے جس کے یہ عنوانات ہیں: صفت شہر مصر۔ صفت شہر مکہ۔ صفت زمین عرب و عجم۔ یہ انتخاب بہت دلچسپ ہے۔ اس میں اس عہد کے مصر، مکہ اور یمن کی تاریخ، جغرافیہ، عمارات، صنعت و حرفت، بازاروں، پھلوں سلاطین اور عوامی خوش حالی کا بیان ملتا ہے۔ اس انتخاب سے معلوم کے تمدن کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد عبدالحمید لاہوری کے شاہ جہاں نامہ کا انتخاب شاہجہاں کی "عبادات شریفہ و عادات منیفہ" کے بیان میں ملتا ہے۔ اس انتخاب کی نثر میں ادبی وزن و وقار زیادہ ہے۔ اس انتخاب سے ایک مغل شہنشاہ کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے جس کے ذریعہ اس کے آئین حکومت کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد انتخاب نامہ خسرواں ہے جس کے عنوانات ہیں "نستمین نوشیرواں" اور "بیت دیکیں ہرمز"۔ یہ انتخاب صرف دس صفحات میں نوشیرواں کے حالات و اقوال پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد عبداللطیف الطسوجی التبریزی کے فارسی ترجمہ الف لیلہ کا انتخاب ملتا ہے (از شب پانصد و سی تا شب پانصد و چہل و سہ) جو سندباد حمال کے قصے پر مشتمل ہے۔ تازی سے فارسی میں

ترجمہ نہایت رواں ہے ۔ غرض کہ جملہ انتخاب نثر سے خالص فارسی اور مسلمانوں کے تمدن کا نقشہ کھنچ جانے کی شرائط پوری ہو جاتی ہیں ۔ متقدم اور متاخر نثر کے نمونے بھی پیش نظر ہو جاتے ہیں ۔ اس بات کے باور کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ یہ انتخاب نثر طلبہ کو روزمرہ کی باتوں کی تحریر کا سلیقہ سکھاتا ہے ۔

انٹرنس کورس فارسی میں انتخاب نثر کے بعد انتخاب نظم ہے (ص ۹۷ تا ص ۱۹۳) جس کا آغاز انتخاب بوستاں (باب چہارم در تواضع) سے ہوتا ہے ۔ یہ حصہ نظم میں طویل ترین انتخاب ہے (ص ۹۷ تا ۱۳۶) اس کے بعد انتخاب سکندر نامہ ہے (ص ۱۳۷ تا ص ۱۵۲) جس کا عنوان ہے "رفتن سکندر نزد نوشابہ بلباس سفارت"۔ اس کے بعد ہشت بہشت کا انتخاب ہے (ص ۱۵۳ تا ۱۵۸) عنوان ہے "افسانہ گفتن آہوی مشکدم و مشک بہ پوست باز کردہ از بطانہ بیروں آوردن"۔ اس کے بعد انتخاب مخزن اسرار ہے (ص ۱۵۹ تا ص ۱۶۳) عنوان ہے "مقالہ سوم در اختلاف و انقلاب حدوث و اختلال امور دنیا"۔ اس کے بعد کلیات سعدی سے ایک قصیدہ اخذ کرکے انتخاب میں شامل کیا گیا ہے (ص ۱۶۴ تا ص ۱۶۶) جس کا مطلع ہے ؎

با مداداں کہ تفاوت نکند لیل و نہار
خوش بود دامن صحرا و تماشای بہار

اس کے بعد محتشم کاسی کے مرثیہ امام حسین کو انتخاب میں شامل کیا گیا ہے (ص ۱۶۷ تا ص ۱۷۲) جس کے بند اول کا پہلا شعر ہے ؎

باز این چہ شورش است کہ در خلق و عالم است ؟
باز این چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است ؟

اس کے بعد دیوان حافظ کا انتخاب ہے (ص ۱۷۳ تا ص ۱۸۸) تعداد غزلیات پچیس[۲۵] ہے ۔ یہ انتخاب ردیف الف ۔ تائے فوقانی ۔ دال مہملہ ۔ سین مہملہ ۔ شین معجمہ ۔ میم ۔ نون اور یائے تحتانی پر مشتمل ہے ۔ اس کے بعد عمر خیام کی رباعیات کا انتخاب ہے (ص ۱۸۹ تا ص ۱۹۳) رباعیات کی کل تعداد چوبیس ہے ۔

انٹرنس کورس فارسی کے انتخاب نظم میں سعدی ۔ نظامی ۔ خسرو ۔ محتشم کاشی ۔ حافظ اور عمر خیام کی رباعیات، غزلیات، مرثیہ، مثنویات اور قصیدہ کو شامل کیا گیا ہے ۔ شاید دیوان حافظ سے پچیس[۲۵] غزلیات کا انتخاب برائے مطالعہ خصوصی تھا ۔ انٹرنس کے طالب علم کی استعداد کو نظر میں رکھ کر ہی شعراء اور ان کے کلام کا انتخاب صنف سخن کے اعتبار سے کیا گیا ۔ قصیدہ سعدی انٹرنس کورس میں شامل ہوا جب کہ منوچہری اور قاآنی کے قصائد ایف اے اور بی اے کے کورس میں شامل ہوئے (حیات شبلی ص ۲۶۵) اس جائزے کے باوصف ان مبادی کا سراغ نہیں ملتا جو شعراء اور ان کے کلام کے انتخاب کے وقت مرتب کے پیش نظر رہے تھے ۔ عہد سامانی سے عہد قاچاری تک کے کثیر التعداد فارسی شعراء میں سے صرف چھ شعراء کس بنیاد پر منتخب ہوئے اور پھر ان کے دواوین سے کس خیال کے مدنظر ان کا کلام اخذ کیا گیا ؟ مثال میں سعدی کی غزلیات کی جگہ قصیدہ کا انتخاب، ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا، خاص طور پر دیباچہ کی عدم موجودگی میں، بہت دشوار ہے ۔

انٹرنس کورس فارسی کے انتخاب نظم کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس میں عشق مجازی اور اس کی جملہ کیفیات کا دخل نہیں ہے ۔ تمام تر زور سبق آموز لٹریچر پر ہے جو مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کے اسلوب میں ہے ۔ اس کا

سبب یہی ہو سکتا ہے کہ علامہ شبلیؒ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے عہد مابعد کے دور اصلاحات سے وابستہ تھے اور ان کی فکر کا مرکز اقدار اسلامی کا احیاء تھا۔

انٹرنس کورس فارسی میں انتخاب نظم و نثر کے بعد "انتخاب از قواعد فارسی" ہے۔ (ص ۱۹۳ تا ص ۲۲۴) قواعد فارسی اور اس کے مولف کا نام درج نہیں کیا گیا ہے۔ انتخاب قواعد میں فعل اسم حرف مصدر کی تعریف اور مصادر کے اقسام و اشتقاق کا بیان ہے۔ خاتمہ انتخاب "خواص حروف تہجی" کے بیان میں ہے۔ اساتذہ فارسی کے اشعار بطور مثال افراط سے نقل کیے گئے ہیں۔ یہ انتخاب فارسی میں ہے جس کے پیش نظر محسوس کرنا پڑتا ہے کہ اس عہد کا معیار تعلیم اور طلبہ کی استعداد علمی قابل رشک تھی۔

علامہ شبلیؒ نے الہ آباد یونیورسٹی کے لیے انٹرنس کورس فارسی سو سال قبل مرتب کیا تھا جو آج نایاب ہے۔ علامہ شبلیؒ کی علمی و ادبی تصنیفات کے مقابلے میں اس وقت اس کو محض فارسی کورس کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں　　ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

چونکہ اس کتاب میں مقدمہ یا دیباچہ نہیں ہے، شعراء اور نثر نگاروں کے حالات اور ان کی کتب کے متعلق معلومات نہیں ہیں۔ فارسی ادب میں ان کے مقام کا تعین بھی نہیں کیا گیا ہے۔ فہرستیں اور حواشی بھی نہیں ہیں۔ ایسا اشارہ بھی نہیں ہے جس سے انتخاب کے ماخذوں کا علم ہو کہ وہ کن مطابع میں اور کب شایع ہوئے۔ لہذا اس انٹرنس کورس فارسی کو مقدمہ حواشی۔ تعلیقات اور ضروری فہرستوں کے ساتھ دوبارہ تیار کرنے کی گنجایش پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا ایک انتقادی ایڈیشن علامہ شبلیؒ کے ایک اہم کام کو مکمل گمنامی سے بچا سکتا ہے۔

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

۳۱؍ جولائی ۱۹۹۶ء[۱]

محترمی مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب! السلام علیکم

معارف بابت جولائی نسبۃً تاخیر سے ابھی کچھ دیر پہلے موصول ہوا، کتابت و طباعت اور تصحیح کا معیار گرا ہوا ہے اس کی طرف توجہ فرمایئے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ دور سے اندازہ ہوجاتا تھا کہ اس رسالے یا کتاب کی کتابت دفتر معارف میں ہوئی ہے۔ موجودہ شمارے کا ص ۷۶ دیکھئے جو بدخطی اور پاشاں نگاری کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اسے سید صاحب علیہ الرحمہ

---

۱ خط کی اشاعت میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ مکتوب نگار نے پہلی دفعہ جب اسے بھیجا تو وہ ڈاک میں ضایع ہوگیا یہ اس کی نقل ہے جو ۱۵ اکتوبر کو ملی۔ اس وقت اکتوبر کا شمارہ شایع ہوچکا تھا، نقل کے ساتھ حسب ذیل گرامی نامہ موصول ہوا" پٹنہ سے ایک خط لکھ چکا ہوں حسب وعدہ مکتوب مورخہ ۳۱ جولائی کی نقل بھیج رہا ہوں۔ وہاں سید شہاب الدین دسنوی صاحب سے ملنے گیا تھا۔ اچھے ہیں، آپ لوگوں کو بہت یاد کرتے رہے، سیرۃ النبی ج ۱ کا نیا ایڈیشن انہوں نے بڑے شوق اور فخر سے دکھایا۔ واقعی بہت خوبصورت ایڈیشن ہے۔ آپ لوگوں کے حواشی وغیرہ سے اس ایڈیشن کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

مکتوب کی رسید ضرور بھیج دیجیے اور ممکن ہو تو اسی ماہ شایع کردیجیے۔ والسلام

مختار الدین احمد

اور آپ کے پیش رو شاہ معین الدین احمد بلکہ سید صباح الدین عبدالرحمن مرحومین بھی دیکھتے تو انہیں رنج ہوتا[1]

یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ مطبع معارف میں جب کمپیوٹر سے کمپوزنگ کے وسائل موجود ہیں اور آپ معارف کے اول و آخر کے کچھ صفحات اس کے ذریعے کمپوز بھی کراتے ہیں تو پھر پورا رسالہ اسی طرح کیوں نہیں شایع کرتے[2]

---

[1] مکتوب نگار کو خود اندازہ ہوگا کہ اب کاتب کم یاب ہوتے جارہے ہیں اور جو ملتے ہیں وہ پہلے کی طرح استادِ فن نہیں ہوتے، معارف پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ تصحیح کے کام میں بھی اسی وجہ سے دشواری ہورہی ہے عموماً معارف کی تصحیح میں اور میرے رفقا خود کرتے ہیں، جولائی کے معارف کی کتابت و طباعت کے وقت میں کلکتہ اور لکھنؤ گیا ہوا تھا، اتفاق سے اسی زمانے میں ضرورتاً میرے ایک رفیق کار بھی باہر چلے گئے اور آنے پر ہم لوگوں کو بھی بڑا رنج ہوا[2] دارالمصنفین کی اکثر مطبوعات عرصہ سے ختم ہیں جن کی برابر مانگ ہوتی رہتی ہے اور نہ بھی ہو تو ہر کتاب کو اسٹاک میں موجود رہنا چاہیے۔ سیرۃ النبی کی جلدیں پلیٹوں پر ہیں جن پر گھس پٹ کر حروف اڑتے جارہے ہیں۔ کہیں کہیں اغلاط بھی در آئے ہیں، اس لیے پہلے اسی کی کمپوزنگ ہورہی ہے جو بہت لمبا کام ہے۔ جب کاتب دیر کردیتے ہیں تو اس خیال سے کہ معارف کی اشاعت میں تاخیر نہ ہو اول و آخر کے حصوں کی جو بعد میں چھپتے ہیں کمپوزنگ کرائی جاتی ہے، صرف شذرات کی کمپوزنگ اس لیے معمول ہوگئی ہے کہ اس میں مواد زیادہ آجاتا ہے۔ یہ مجبوری بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ابھی بڑی کوشش کے بعد دارالمصنفین صرف ایک آپریٹر تیار کرسکا ہے، نئے اور غیر مشاق ہونے کی وجہ سے ابھی یہ چھ سات گھنٹوں میں صرف آٹھ دس صفحے کمپوز کرتے ہیں۔ اعظم گڑھ میں بجلی کی آنکھ مچولی بھی ہوتی رہتی ہے اس کے غائب (بقیہ حاشیہ ص ۳۷۷ پر)

موجودہ شمارے کا ابھی صرف ایک مضمون "عہد اسلامی میں کتبخانوں کا مقام و ارتقا" پڑھ سکا ہوں۔ جس کے بارے میں آپ کے ادارتی نوٹ سے اطلاع ملتی ہے کہ یہ فرانسیسی رسالہ DER ISLAM میں طبع شدہ ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ ہے۔ DER ISLAM یورپ کے مستشرقین کا مشہور علمی رسالہ ہے اور یہ فرانسیسی میں نہیں جرمن زبان میں جرمنی سے چھپتا ہے۔ DER خود جرمن زبان کا لفظ ہے جو انگریزی لفظ THE کے مرادف ہے۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ آپ اصل مصنف/مضمون نگار کو مترجم کے برابر بھی درجہ نہیں دیتے اور اس کے لکھے ہوئے مضمون کے ساتھ اس کا نام تک درج کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ مصنفین اور مضمون نگاروں کی یہ حق تلفی ہے اور کسی طرح مناسب نہیں[1]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۶) ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ کمپیوٹر میں بھی بعض دفعہ ٹکنیکل خرابی ہوجاتی ہے، اسی لیے اکتوبر کے معارف کے شذرات کاتب سے لکھائے گئے اور اس کی کیا ضمانت کہ کمپیوٹر کتابت میں غلطیاں نہ ہوں گی۔ اب اگر مکمل معارف کی کمپوزنگ بھی کمپیوٹر سے کرائی جائے تو کتابوں کا مسئلہ کیسے حل ہوگا[1] مضمون عرصہ سے آیا ہوا تھا مترجم کو خطوط لکھے گئے کہ مضمون نگار اور رسالہ کے ناموں کی صراحت کردیں مگر انہوں نے جس رسالہ سے ترجمہ کیا تھا وہ ان کے یہاں سے غائب ہوگیا، انہوں نے یادداشت سے جو کچھ بتایا وہ مضمون کے آخر میں شامل ہے، اب بھی اگر مضمون نگار کا نام معلوم ہوجائے تو "حق تلفی" کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

ہم مکتوب نگار کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے فروگزاشتوں کی (بقیہ حاشیہ ص ۳۷۸ پر)

اب اس مضمون کے سلسلے میں بعض گزارشات پیش کی جاتی ہیں:

(معارف جولائی) ص ۲۹ ابوبکر السولی۔ ذخیرۂ کتب جمع کرنے والوں میں ابوبکر السولی کا ذکر آیا ہے، اصل مضمون میں AL-SULI ہوگا ترجمہ نگار بظاہر "الصولی" سے واقف نہیں، انہوں نے اسے "السولی" کر دیا۔ یہ خلیفہ مکتفی اور خلیفہ مقتدر کے ندیم اور "کتاب الاوراق" کے مصنف ابوبکر محمد بن یحییٰ بن عبداللہ بن العباس بن محمد الصولی الشطرنجی (متوفی ۳۳۵ھ/۳۳۶ھ) ہیں جنہوں نے ابواسحاق ابراہیم بن العباس بن محمد الصولی (۱۷۶ھ - ۲۴۳ھ) کا دیوان جمع کیا تھا اس کا ایک نسخہ استاذی علامہ عبدالعزیز المیمنی رحمۃ اللہ علیہ کو کتبخانۂ وہبی آفندی (ترکیہ) میں ملا تھا جسے انہوں نے قاہرہ سے ۱۹۳۷ء میں ایک مجموعہ "الطرائف الادبیۃ" میں شایع کر دیا تھا۔

ص ۳۰ وزیر مہلبی۔ اصل مضمون میں AL-MUHALLABI ہوگا تعجب ہے کہ ترجمہ نگار کا ذہن "المہلبی" کی طرف نہیں گیا۔ یہ معزالدولہ ابوالحسین احمد بن بویہ دیلمی کے وزیر ابو محمد الحسن بن محمد ہارون بن قبیصہ بن المہلب بن ابی صفرۃ الازدی (۲۹۱ھ - ۳۵۲ھ) ہیں جو بہت اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق رکھتے تھے اور مصنفوں اور ادیبوں کے سرپرست تھے۔

ص ۳۹ "الشریف الرازی" نہیں "الشریف الرضی" لکھنا چاہیے تھا۔ ترجمہ نگار کو یہ غلط فہمی بھی انگریزی میں AL RAZI لکھے جانے کی وجہ سے ہوئی۔ یہ خلیفہ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۷) جانب توجہ دلائی اور بڑے اخلاص، دردمندی اور دلسوزی سے توجہ دلائی، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ توقع ہے کہ آیندہ بھی وہ یہ سلسلہ جاری رکھیں گے، افسوس ہے کہ اب نقد و احتساب کرنے والے کرم فرما عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔

عباسی الطائع للہ اور بہاء الدولہ البویہی کے عہد کے نقیب الاشراف الطالبیین اور مشہور ادیب اور نغز گو شاعر الشریف الرضی ابوالحسن محمد بن الطاہر الموسوی (۳۵۹ھ - ۴۰۶ھ) ہیں۔

اسی طرح ص ۲۶ کے حاشیے میں وفیات الاعیان کے مرتب کا نام محی الدین "عبدحامد" چھپا ہے۔ عبدحامد تو عبدالحامد کی خرابی ہے اور چونکہ ترجمہ نگار نے اصل مضمون میں ABDUL HAMID چھپا ہوا دیکھا ہوگا، انہوں نے عبدالحمید کی جگہ عبدالحامد پڑھا اور معارف میں "عبدحامد" ہوگیا۔ الاستاذ محی الدین عبدالحمید ہمارے عہد کے مشہور مصنف و محقق تھے جن کا چند سال پہلے مصر میں انتقال ہوا۔ متعدد قدیم اور مفید عربی متون انہوں نے مرتب کر کے شایع کیے ہیں۔ ہاں وفیات الاعیان کے نام میں "انباء" کا لفظ ساقط ہوگیا ہے۔ کتاب کا نام "وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان" ہے۔

ص ۴۰، ۴۱۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے وزیر اور اس عہد کے مشہور مصنف و انشاپرداز کا نام ایک جگہ "قاضی الفاضل" دوسری جگہ "قاضی فاضل" لکھا ہے، صحیح نام "القاضی الفاضل" لکھنا چاہیے تھا۔ یہ ابوعلی عبدالرحیم البیسانی العسقلانی (۵۲۹ھ/۵۹۶ھ) ہیں۔ اسی صفحے کے حاشیے پر الحوادث الجامعۃ کے مصنف کا نام "ابن الفوقی" (قاف سے) چھپ گیا ہے یہ (فا سے) "ابن الفوطی" ہونا چاہیے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے جس کی تصحیح نہ ہوسکی۔

اب دو تین باتیں جن کا تعلق ترجمہ نگار سے نہیں اصل مضمون نویس سے ہے۔

ص ۴۴ جن مصنفین کی کتابیں "الامالی" کے نام سے مشہور ہیں ان میں مضمون نگار

نے "الزجاج" کا نام بھی لکھا ہے۔ ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن سری بن سہل الزجاج النحوی (متوفی ۳۱۱ھ) کی "الامالی" کا ذکر اگرچہ ابن خلکان نے کیا ہے لیکن یہ عرصے سے ناپید ہے۔ ہاں "الزجاجی" (ابو القاسم عبد الرحمٰن بن اسحاق النحوی البغدادی متوفی ۳۳۷ھ) کی "الامالی" موجود ہے اور اس کے کم از کم دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ایک ایڈیشن بہت عرصہ ہوا مصر سے نکلا تھا اور دوسرا الاستاذ عبد السلام محمد ہارون نے مرتب کر کے قاہرہ سے ۱۳۸۲ھ میں شایع کیا ہے۔ کتب الامالی کے ذکر میں مضمون نگار کو "الزجاج" کی الامالی کی بجائے "الزجاجی" کی الامالی کا ذکر کرنا چاہیے تھا۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ جن علماء کی "الامالی" مشہور اور متداول ہیں جیسے الشریف الرضی کے بھائی الشریف المرتضیٰ جن کی الامالی "الغرر والدرر" کے نام سے دوبار چھپ چکی ہے، محمد بن العباس بن محمد بن ابی محمد یحییٰ بن المبارک الیزیدی (متوفی ۳۱۰ھ) جن کی کتاب الامالی دائرۃ المعارف حیدرآباد سے ۱۹۴۸ء میں شایع ہوئی اور ابن الشجری جن کی کتاب بھی اسی موضوع پر اسی نام سے حیدرآباد ہی سے اشاعت پذیر ہوئی ہے، مضمون نگار کی فہرست سے خارج ہیں اور لطف یہ ہے کہ ابن دُرید اور بدیع الزمان الہمدانی (الہمذانی) کی "الامالی" کا ذکر کیا ہے اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی "الامالی" مشہور ہیں۔ مشہور ہونا تو کجا ان دونوں مصنفین کی "الامالی" کا ذکر بھی کہیں دیکھنے میں نہیں آیا، دائرۃ المعارف الاسلامیہ اور بروکلمان کی تاریخ آداب عربی میں ان کی تصانیف کی فہرست موجود ہے لیکن اس کی کتاب الامالی کا دور دور کہیں ذکر نہیں۔

اس مضمون نگار نے لکھا ہے کہ خلیفہ ناصر [الناصر] لدین اللہ کے کتبخانے

کی فہرست کی تعداد چھ ہزار جلدوں سے زیادہ تھی (ص۲۰) اس روایت کے لیے مضمون نگار نے ابن الفوطی کی الحوادث الجامعۃ کا حوالہ دیا ہے، یہ اس وقت میرے پیش نظر نہیں کہ یہ معلوم ہو کہ اس نے کیا لکھا ہے اور مضمون نگار نے کیا سمجھا لیکن کسی کتب خانے کی فہرستوں کا چھ ہزار جلدوں میں ہونا کسی طرح قرین قیاس نہیں۔

عہد اسلامی کے کتب خانوں کے ذیل میں دو اہم کتب خانوں کا ذکر نہیں۔ ایک تو مشہور مورخ یاقوت الحموی (۵۷۴ھ/۶۲۶ھ) صاحب معجم الادباء کا بیش قیمت کتب خانہ جو اس نے الشریف ابو الحسن علی بن احمد الزیدی (متوفی ۶۲۶ھ) کے مشہد کو وقف کر دیا تھا اور دوسرا کتب خانہ جمال الدین محمود بن علی الاستادار الظاہری (متوفی ۷۹۹ھ) جو قاہرہ میں تھا اور نفائس مخطوطات پر مشتمل تھا۔ محمود نے اپنا کتبخانہ مدرسہ محمودیہ پر وقف کر دیا تھا، کتابوں کی تعداد چار ہزار تھی۔ ابن حجر العسقلانی بہت دنوں تک اس کے ناظم رہے۔ جلال الدین السیوطی نے اس کتبخانے سے شاید سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا تھا۔

خط کی طوالت کی معذرت چاہتا ہوں، والسلام

مختار الدین احمد

ضمیمۂ مکتوب (۱)

پٹنہ

۲/۱۰/۹۶ء

جناب اصلاحی صاحب مکرم و محترم السلام علیکم

مکرمت نامہ مورخہ ۱۸/ستمبر دوسرے خطوط کے ساتھ کل یہاں پہونچا ہیں یہاں کی

یونیورسٹی کے ایک کام سے آیا ہوں۔

میں نے ایک بہت تفصیلی خط ۳۱ جولائی کو (جس دن معارف (جولائی) ملا اسی دن) لکھ کر آپ کو بھیجا تھا۔ آپ اور آپ کے قارئین پڑھیں گے تو اسے پسند کریں گے۔ آپ شاید اس زمانے میں باہر گئے ہوئے ہوں، جناب ہلالی صاحب کی ڈاک احتیاطاً دیکھ لیجیے، ورنہ علی گڑھ پہنچ کر میں انشاء اللہ آپ کو بھیج دونگا، خط محنت اور توجہ سے لکھا تھا اسلیے اس کی عکسی نقل غالباً رکھ لی تھی مل گئی تو ارسال خدمت کروں گا۔

کل خدا بخش لائبریری اور بہار اردو اکیڈمی گیا تھا، اول الذکر نے تذکرۂ شعرائے فارسی انیس الاحباء مولفہ موہن لال انیس (متوفی بعد ۱۲۲۹ھ) مرتبہ پروفیسر انوار احمد سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی شایع کرایا ہے۔ ابھی چند نسخے صرف جلد بند کے یہاں سے آئے تھے میں نے ایک نسخہ خرید لیا، اس طرح اس کتاب کا پہلا خریدار میں ہوا، موجودہ ڈائرکٹر حبیب الرحمن چغانی صاحب سے دیر تک گفتگو لائبریری کے مسائل خاص طور پر یہاں کی مطبوعات کے بارے میں ہوتی رہی، خدا بخش جرنل کا شمارہ ۱۰۵ چھپ گیا ہے، آجکل سرورق وغیرہ چھپ رہا ہے۔

بہار اردو اکیڈمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری سے بھی ملاقات ہوئی۔ احمد یوسف صاحب نائب صدر سے آج ملوں گا۔ نوری صاحب نے حسب ذیل مطبوعات جو ابھی پریس سے نکلی ہیں پیش کی ہیں:

مقالات سید حسن عسکری مرتبہ سید محمد حسنین۔

کلیم الدین احمد سمینار کے مقالات

قاضی عبدالودود سمینار کے مقالات

مشتاق احمد نوری صاحب نے اپنے افسانوں کا مجموعہ بند آنکھوں کا سفر کا ایک نسخہ بھی مرحمت فرمایا، ان کا پہلا مجموعہ تلاش ۱۹۸۰ء میں شایع ہوا تھا،

امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

مختار الدین احمد

ضمیمۂ مکتوب (۲)

علی گڑھ

۱۸/۱۰/۹۶ء

مکرمی و محترمی السلام علیکم

ابھی گرامی نامہ مورخہ ۵/اکتوبر ملا، صورت حال سے آگاہی ہوئی۔ آپ لوگوں کی مشکلات کا اس تفصیل سے علم نہ تھا۔ ان حالات میں آپ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ لائق تحسین ہے خدا کرے حالات جلد بہتر ہوں۔

میری تحریر کا عام انداز اور لب ولہجہ تو نرم ہی ہوتا ہے اگر مراسلے کا انداز تلخ ہو گیا ہے تو نرم کر دیجیے جہاں جہاں آپ چاہیں، لیکن پھر بھی اس کی اشاعت سے معارف کی ساکھ متاثر ہونے کا خیال ہو تو ہر گز نہ چھاپیے اور واپس کر دیجیے اس لیے کہ یہ میرے منشا کے خلاف ہے۔

ڈاکٹر ریاض الرحمن شروانی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کی تیاریوں کے سلسلے میں پٹنہ گئے ہوئے تھے بخیر ہیں، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کل تشریف لائے تھے اچھے ہیں اور اپنے علمی کاموں میں مصروف۔ سید شہاب الدین دسنوی صاحب سے ملاقات کا حال پہلے لکھ چکا ہوں۔

امید آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

مختار الدین احمد

علی گڑھ

۸؍۱۱؍۹۶ء

مکرمی و محترمی ! السلام علیکم

اکتوبر کا معارف کسی قدر تاخیر سے موصول ہوا۔ ممکن ہے ڈاک کی ہڑتال کی وجہ سے پوسٹ ہونے میں تاخیر ہوئی ہو۔

اداریہ ہر اعتبار سے نہایت موزوں، برمحل اور معتدل ہے۔ اس لیے اس میں کسی ترمیم یا اضافے کی بالکل ضرورت نہیں محسوس ہوتی ہے۔ نہ معلوم ارباب اقتدار بالخصوص وائس چانسلر صاحب کی نظر سے گزرتا بھی ہے یا نہیں۔ اگر گزرے اور وہ توجہ فرمائیں تو ضرور مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

عبد اللطیف اعظمی صاحب نے اپنے مراسلے میں بلا وجہ تنازعہ کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر یونیورسٹی کا قاعدہ ہے کہ پرو وائس چانسلر کے نہ ہونے کی صورت میں کوئی سینیر پروفیسر وائس چانسلر کی غیر موجودگی میں اس کا کام دیکھتا ہے اور قائم مقام وائس چانسلر کہلاتا ہے۔ ہو سکتا ہے پروفیسر محمد مجیب کی وائس چانسلری میں ڈاکٹر سلامت اللہ یہ خدمت انجام دیتے رہے ہوں اور بعد میں ضیا صاحب۔ بہر حال میرے نزدیک اس موضوع پر بھی مزید کچھ لکھنا اور چھاپنا غیر ضروری ہے۔

ممکن ہے، دار الارشاد کے سمینار میں صرف ایک دن کے لیے اعظم گڑھ حاضر ہوں یعنی ۳۰ نومبر کو وہاں پہنچوں اور یکم دسمبر کو وہاں سے واپس روانہ ہو جاؤں۔

آپ کے وہاں انشاء اللہ فروری ۱۹۹۷ء میں ضرور مقالہ پڑھنے کے لیے حاضر ہونگا، ۳۰ اکتوبر کو جامعہ ملیہ میں پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ دیا تھا۔ عنوان تھا سر سید اور مولانا آزاد بحیثیت مفسر قرآن۔ ایک نقل ملاحظہ ہو۔

نیاز مند : ریاض الرحمن شروانی

ادبیات

ابلیس کی مجلس شوریٰ

(اجلاس چہارم)

از جناب سید غلام سمنانی صاحب

"ڈاکٹر اقبال نے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کا پہلا اجلاس ۱۹۳۶ء میں قلم بند کیا، ۱۹۸۳ء میں کیفی اعظمی نے اجلاس دوم کی روداد تحریر کی، ستمبر ۱۹۹۲ء میں پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن نے اجلاس سوم کی تفصیلات بیان کیں اور اسے انہوں نے یوم اساتذہ کے مشاعرہ منعقدہ دلی میں پڑھکر سنایا، ذیل میں اجلاس چہارم کی کیفیات پیش ہیں۔"

ابلیس

کیوں دگرگوں ہو رہا ہے پھر مزاج کائنات ۔۔۔ تھا مرا محکوم کل تک یہ جہان بے ثبات

تھی زمام کار عالم میرے شر کے ہاتھ میں ۔۔۔ میرے ہی شر کے فسوں خوردہ رہے یہ شش جہات

مشرق و مغرب تھے میرے دام گیسو میں اسیر ۔۔۔ چھپ چکی تھی گرد رہ میں منزل ذات و صفات

میری ہی فکر و فطانت بن گئی آشوب جاں ۔۔۔ میرے ہی فہم و فراست محشر تنزیہہ ذات

ذہن تھا تاریک اس کا، جانتا تھا کیا فرنگ ۔۔۔ میں نے بتلائے ہیں اس کو سب غوامض، سب نکات

میرے ہی خوان کرم کے ریزہ چیں مصر و عراق ۔۔۔ خشک کر دوں میں ابھی یہ دجلہ و نیل و فرات

ہو چکی پامال مجھ سے رام و گوتم کی زمیں ۔۔۔ ہر گلی کوچے میں تم پاؤ گے اک اک سومنات

مجھ کو بھی حاصل قیادت آمر و مامور کی اب ہیں میرے واسطے سب عادیات و موریات
کیا ہوا؟ کیونکر ہوا؟ کیسے ہوا اور کب ہوا؟ مل گئی ہے خواب سے کیونکر مسلماں کو نجات؟

دوستو! معلوم ہے کچھ بھی کہ کیا ہونے کو ہے؟
وہ قیامت کونسی ہے جو بپا ہونے کو ہے؟

مشیر اول

شرق سے تا غرب تیرے فتنوں کی جولانیاں فرش سے تا عرش ہیں تیری فسانہ خوانیاں
ہیں لب قدوسیان عالم بالا پہ بھی تیرا عجز بندگی اور وہ تری قربانیاں
جو بھی ہنگامے ہیں ہر سو ہیں فقط دم سے ترے ہیں مفید کار کتنی تیری نا فرمانیاں
تھا وہ انکار ابا، تیرا شعور ذات تھا کہہ رہے ہیں سب جسے تھیں وہ تری نادانیاں
غیرت و شرم و حیا، اب ہو گئے حرف غلط تو نے کر دی ہیں فراہم کس قدر آسانیاں
دھندھلکوں نے یاس کے کچھ ایسا گھیرا ہے تجھے پڑ چکی ہیں ماند تیری فکر کی تابانیاں
تو بھی ہے پابند قانون مکافات عمل رنگ اپنا لائیں آخر تیری بدعنوانیاں
اب نہیں کھلتا ہے تجھ پر کوئی بھی گردوں کا راز اب کہاں پا کوبیانی وہ آستیں افشانیاں
نقص کوئی بھی نہ تھا تیرے نظام کار میں کم نہیں ہونے کو آتی ہیں مری حیرانیاں

وائے قسمت! جودت فکر و نظر کھوئی گئی
ہر متاع اعتبار حیلہ گر کھوئی گئی

مشیر دوم

اے کہ تجھ پر منکشف اسرار بزم دیر و زود ہے ترے دست تصرف میں جہان ہست و بود

تو ملائک کا معلم، مرشد کرّوبیاں ساری عظمت کھو دی تو نے، کر کے انکار سجود
کس طرح تو نے نکلوایا تھا جنت سے انہیں دیکھتا ہی رہ گیا تھا دیدۂ چرخ کبود
فتنۂ صیہونیت ہے تیرا ممنون کرم مغتنم اس کے لیے تھا کس قدر تیرا وجود
مصدر جبر و تشدد، حیلہ و مکر و ریا دامن تہذیب پر اک داغ ہے قوم یہود
تو نے بخشا ہے کسی شے کو میان عرش و فرش چشمہ سار و بحر و دریا، شہر و صحرا، نہر و رود
دیکھ وہ گرتی ہوئی دیوار قصر کبر کی ہے خبر کچھ؟ اٹھ رہا ہے تیرے کاشانے سے دود
ہو چکا ہے خرقۂ تزویر تیرا چاک چاک تیرے مکر و دجل کے بکھرے ہوئے ہیں تار و پود
ہو چکا پرّاں، کمان قدر سے تیر قضا عقدۂ مشکل کی تیرے اب نہیں ممکن کشود

انتقام حق کا تیر بے خطا سینے میں ہے
مر نہیں سکتا مگر کیا لطف بھی جینے میں ہے

مشیر سوم

دیکھتا ہے جو دکھائے گنبد آئینہ گوں کیوں نہ کرب روز و شب تیرا ہو اب حد سے فزوں
پھر حسینیت کے ہاتھوں میں ہے تیغ بے نیام پھر یزیدیت کا پرچم ہو رہا ہے سرنگوں
کیا ہزیمت ہی ہزیمت ہے تری تقدیر میں تیری ذریت کے بھی احوال ہیں زار و زبوں
جرمل و کچنر، ایلنبی کیا تھے؟ تیرے زر خرید ان کو سکھلائے تھے تو نے سارے آداب جنوں
تو نے بخشی تھی حرارت ہر تن بے روح کو اس کی رگ رگ میں رواں تھا تو مثال موج خوں
تیرا ایک ادنیٰ اشارہ تھا خلافت کا زوال تھا حجاز و پارس میں کارآزما تیرا فسوں
ابرکسا نے کیونکر تجھے پسپا کیا؟ کاش کوئی تو سمجھ لیتا ترا سوز دروں

تو کسی کی بھی بجھا سکتا نہیں اب تشنگی
تیرے میخانے کے ہیں مینا و ساغر واژگوں

اب تری تقدیر میں نومیدیٔ جاوید ہے
تیری حد مقدرت سے ہو چکی ہر شے برون

اب ترا ہر ساز محروم نوا ہونے کو ہے
دیکھنا ہے غیب سے کیا رونما ہونے کو ہے؟

مشیر چہارم

دیکھ اب تیرا وجود نا سزا خطرے میں ہے
اس رباط دہر میں تیری بقا خطرے میں ہے

یہ صداقت، یہ عدالت، یہ مروت، یہ وداد
کیمیا سازوں کے ہاتھوں کیمیا خطرے میں ہے

بدگماں کچھ ہو چلے ہیں جادہ پیمایان شوق
راہ و منزل اک طرف، خود رہنما خطرے میں ہے

خلقت آدم سے پہلے کیا تھیں تیری وسعتیں
ابتدا تو خوب تھی ہاں، انتہا خطرے میں ہے

تیری قید فکر میں کون و مکاں کی وسعتیں
تیرے لب پہ تیرا حرف مدعا خطرے میں ہے

وائے قسمت بھول بیٹھا تو وہ پیمان وفا
اب تو ہر اک عہد و پیمان وفا خطرے میں ہے

باغبان گلشن ایجاد ہے چیں بر جبیں
نکہت گل، موجۂ باد صبا خطرے میں ہے

لا سکے گا کیا بھلا تو نافۂ مشک تتار
اب ختن، خطرے میں ہے، دشت ختا خطرے میں ہے

مل سکے گا کیا تجھے اب در شہوار مراد
ساحل طوفاں تو کیا خود ناخدا خطرے میں ہے

اب دعاؤں میں تری کچھ ہو اثر، ممکن نہیں
کوئی تقدیر الٰہی سے مفر ممکن نہیں

مشیر پنجم

اے کہ تو ہر اک فساد و فتنۂ نو کا سبب
تھا تری تجسیم وہ لو رنس بے جاہ و نسب

اس نے بھڑکائے تھے شعلے نفرت و تفریق کے
اس نے برہم کی بساط امن فردوس عرب

وہ شریف ابن شریف ابن شریف ابن شریف
قلزم شر میں ترے تھا کشتیٔ ساحل طلب

کھو چکی تیرے ہنر سے تیغ فیصل اپنی آب
ہو گیا وہ عبد تیرا جو کبھی تھا عبد رب

کس کے ہاتھوں سے ہوئی تاراج تقدیس حرم
وادریغا، حسرتا، یا للعجب، ثم العجب

چھین لی تھی تو نے ان ہاتھوں سے شمشیر دودم
لوٹ لی تھی تو نے مومن کی متاع تاب و تب

ہو گئی شاید دعائے صبح اس کی مستجاب
ہو گئی شاید رسا، اس کی فغان نیم شب

اب ہوئی سرسبز جا کر کچھ نہ کچھ کشت حجاز
کر دیا تھا تو نے اس کو بے نخیل و بے رطب

پھونک دے گی تجھ کو تیری آگ اے آذر نژاد
ہے فروزاں کس قدر وہ آتش قہر و غضب

تجھ پہ نازل اب عتاب یزدی ہونے کو ہے
تو شکار انتقام سرمدی ہونے کو ہے

مشیر ششم

ساکنان ہند کو تو نے کیا ہے مشتعل
ملتیں یکدل جو تھیں ان کو کیا تو نے دو دل

زخم کچھ ایسے لگائے ہیں دل بے داغ پر
کر نہیں سکتا انہیں کوئی بھی مرہم مندمل

نفرت و بغض و عداوت، یہ نفاق و افتراق
کس قدر ہیں روح فرسا کس قدر ہیں جانگسل

کر دیا ہر عارف و عامی کو تو نے غرق خوں
کیا نہ ہوں گے تیرے اعضا و جوارح مضمحل

دے دیا تو نے زر راہ جو ذا اہل ہند کو
ایک کرب بے نہایت، ایک درد مستقل

ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں تیرے طالع آزما
تا نہ کوئی بھی ترے مکر و ریا میں ہو مخل

ہے وہی اسرار کا محرم ترے از روے صدق
جو نہ ہو کردہ گناہوں پر بھی اپنے منفعل

تیری کارفرمائی، تیری عظمت کا زوال　　اے کہ تو مردود قربت، اے کہ تو فعال و مغفل

خالی از حکمت نہیں ہوتا کوئی فعل حکیم　　شر کی یہ آزادیاں اور خیر ہو یوں پابگل!

یہ زمین خلد آئیں اک جہنم ہوگئی

جو نہ تھی نم آشنا وہ آنکھ بھی نم ہوگئی

ابلیس

(۱)

تم نے سب کچھ سچ کہا ہے اور دلائل ہیں قوی　　باج دیتی تھی مجھی کو قیصری و خسروی

میرا کید و مکر وابستہ ہے میری ذات سے　　جس طرح ہو قافیئے کے واسطے حرف ردی

میں کہ ہوں آتش نفس، آتش نژاد، آتش ضمیر　　میری قسمت میں نہیں فیض نجات اخروی

ہے مرا پرداختہ اس دور کا سارا نظام　　ہے مری پروردۂ آغوش تہذیب نوی

اشتراکیت ہوئی میرے نفس سے بارور　　میرے ہی زلّہ ربا ہیں مزدکی و مانوی

ہوں مصاف آرائیں ایسی امت بیدار سے　　کرچکی ہے ختم جو فرق ایاز و غزنوی

غرق ہونے کو ہے میری آل و ذریت تمام　　ساحل دریا ہے اور ضرب عصائے موسوی

ہوگئی ہیں خواریاں اتنی کہ اب کہتا ہے دل　　جا کے ہو جاؤں کسی دشت گماں میں منزوی

ہیں اسی کی چشم و ابرو کی کرشمہ زائیاں　　جو خدا ہے اور ہے عرش علیٰ پر مستوی

حق یہی ہے قہر یزداں مشتعل مجھ سے ہوا

محشر غم یہ جہان آب و گل مجھ سے ہوا

---

(۲)

ہم نشینو! یہ بھی ہے اک باعث توقیر غم　　ہند سے اٹھا ہے جو صاحب دل و صاحب قلم

وہ کلیم ارض مشرق، نغمہ ساز بے بدل　　سرگروہ عاشقاں، سرخیل ارباب ہمم

بھیجتا ہے ارمغاں اپنا وہ آنسوئے حجاز　　ہند میں رہتا ہے اور گاتا ہے نغمات حرم

صاحب ضرب کلیم و جان اسرار و رموز　　دیکھتا ہے دل کے آئینے میں تقدیر امم

کارواں کے واسطے بانگ درا اس کا نفس　　بال جبریل اس کی فکر تازہ کار و تازہ دم

اس کا ایک اک حرف کیا ہے؟ گوہر کان خرد　　اس کا ایک اک لفظ کیا ہے؟ در شہوار حکم

ہاں لٹا دی اس نے اپنی دولت فکر و نظر　　ہوگئے نطق آشنا کج مج بیانان عجم

اس نے سمجھیں میری چالیں اس نے جانے میرے بھید　　فاش کر کے رکھ دیا اس نے مرا سارا بھرم

ہے اسی کا نعرۂ حق، سد راہ اختیار　　کردیا تھا میں نے بیت اللہ کو بیت الصنم

خاکدان دہر میں کیسی خوشی میرے لیے

ستم قاتل بن گئی اس کی خودی میرے لیے

ندائے غیب

(۱)

پھر وہی قرآن ہوگا سب کا دستور حیات　　پھر وہی حرف منزّل ہوگا نشور حیات

شمع پھر بزم جہاں میں ہوگی روشن علم کی　　ہوگی پھر نا ظورۂ تہذیب مسرور حیات

یہ گماں آباد ہوگا زیر فرمان یقیں　　کوہ و صحرا، دشت و در پھر ہوں گے معمور حیات

ہو رہا ہے ہر نفس اب فاتح مرگ و فنا　　اس سے پہلے تھا کبھی ایسا نہ مقدور حیات

لینن و استالن و انجلز ہیں پادر ہوا
تھی تہہ دامان ظلمت شمع پر نور حیات

اب نہ ہوگا کوئی سرمد لقمۂ تیغ ستم
اب چڑھے گا دار پر کوئی نہ منصور حیات

اب بپا ہوگا جہاں میں اک نظام معدلت
ہوگا اب نالہ کناں کوئی نہ مجبور حیات

ہیں طنابیں خیمۂ طاغوت کی ٹوٹی ہوئی
کیا بجھائے گا کوئی اب شعلۂ طور حیات

اب نہ ہوگا کوئی بھی شکوہ گذار رنج و غم
لے لو اب عریاں تنو! ستجاب وسیفور حیات

اس عجوز دہر پہ طرفہ شباب آنے کو ہے
ہو مبارک، اہل عالم! انقلاب آنے کو ہے

(۲)

جس نے مذہب کو کہا افیون، تھا وہ اک بلید
فتنہ پرور، فتنہ جو، غارت گر نسل جدید

منتہائے فکر اس کا، عالم جسم و جماد
روح و دل سے ہو نہ پائی اسکی کچھ دید و شنید

کی نہ اس نے کوئی بھی معروف و منکر میں تمیز
منعقد کی آکے اس نے محفل نوش و نشید

اہل مغرب پر کیا تھا اس نے مذہب کو قیاس
تھا نہ اس کے سامنے وہ مصحف رب مجید

جس کی ایک اک سطر ہے سعی و عمل کی ترجماں
جوہر معنی کی ایک اک لفظ میں جس کے کشید

جس نے ہر شئے میں کیا برپا نظام عدل و داد
کیا کواکب کیا مہ و خور کیا قریب اور کیا بعید

اس نے بتلایا ہے فرق مقتدی و مقتدا
امتیاز مرشد و مسترشد و پیر و مرید

آسماں سے جب نزول وحی ربانی ہوئی
عالم انسانیت کا تھا وہی روز سعید

اس نے مذہب کو دیا ہے اسم جامع "دین" کا
دین ایسا جو ستم کیشوں کی خاطر اک وعید

"دین" جسم و روح کا اک ارتباط خاص ہے
جسم کی تطہیر ہے اور روح کا اخلاص ہے

نغمۂ ملائک

نو عروس شوق با ناز و ادا اٹھی تو ہے
دور وہ مغرب زمیں سے اک صدا اٹھی تو ہے

کر ہی جائے گی مشام جاں کو نکہت آشنا
بستر گل سے یہ دیکھا ہے، صبا اٹھی تو ہے

کھیتیاں سرسبز ہونگی، کھل اٹھیں گے باغ و راغ
وہ افق پر رقص فرماتی گھٹا اٹھی تو ہے

وادی و کہسار پھر معمور ہونگے گیت سے
زندگی نغمہ بلب، نغمہ سرا اٹھی تو ہے

اس شکست و ریخت میں ہے راز تعمیر و طرب
موج طوفاں خیز بحر ابتلا اٹھی تو ہے

نظم و ضبط عالم ایجاد برہم ہے ضرور
ملت بیضا بہ تسلیم و رضا اٹھی تو ہے

اس کا دریائے کرم اب آگیا ہے جوش پر
دیکھ، وہ موج عطائے بے خطا اٹھی تو ہے

دیکھ لے، وہ شمع ابلیسی بجھانے کے لیے
اس کے دشت قہر سے باد فنا اٹھی تو ہے

کر کے عزم انعقاد مجلس تنظیم عدل
امت ختم الرسل، خیر الوریٰ اٹھی تو ہے

قاضی تقدیر کا یہ فیصلہ صادر ہوا
دور اب فرمانروائی کا تری آخر ہوا

سخن شاعر

(۱)

گامزن ہے سوئے منزل، امت خیر الانام
وہ گروہ نیک بختاں فتوت التزام

حامد و محمود و احمد، وہ محمد مصطفےٰ
رحمت ہر دو جہاں، رحمت لقب، رحمت تمام

وہ حبیب کبریا، وہ سرور امی لقب
بھیجتا ہے جن پہ مومن دل سے ہر ساعت سلام

ہوگئے آباد ویرانے، بسی ہیں بستیاں
ہے یہ فیض مقدم پیغمبر صحرا مقام

لٹ چکی کب کی متاع بے بہائے بعل و نسر
ہو چکے ہیں لات و عزیٰ کے تہی مینا و جام

"گندم از گندم بروید، جو نہ جو" ہے رمز زیست
ہے اسی پر منحصر اس دہر کا سارا نظام

گوشۂ عزلت میں اپنے جو ہے محدود انہیں
بارگاہ ایزدی سے مل گیا اذن خرام

لے کے درمان دل مجروح آئے اپنے ساتھ
زخمہائے جسم و جاں کا بن کے آئے التیام

جو تھے کل تک دور وصل شاہد مقصود سے
مل رہی ہے آج ان کو دعوت دیدار عام

کفر و عصیاں میں مجال دم زدن باقی نہیں
ہے بہر سو نور یزداں اہرمن باقی نہیں

(۲)

منتظر ہے اپنے ایوبی کی پھر وہ سرزمیں
ہو چکی ہے خم جہاں گردن فرازوں کی جبیں

ہوگیا ہے انکا زہرہ آب جو تھے شیر دل
دیکھ کر وہ آب شمشیر ہلاکت آفریں

منزل اول یہی ہے کاروان صدق کی
ہاں یہی ہے رہگزار قافلہ سالار دیں

ان کے آنے سے معطر ہوگئے دشت و دمن
چل پڑی گویا نسیم مشک بیز و عنبریں

طرفہ تر مفتوح و فاتح، طرفہ تر فتح و ظفر
پا پیادہ خود، غلام بارگہ ناقہ نشیں

آہ یہ ارض مقدس مسکن پاکان دہر
آہ یہ قلب و نگاہ و روح کی خلد بریں

اس کی پامالی بھی ہے اک قصۂ مکر و دغا
اس کی بربادی بھی ہے اک داستان بغض و کیں

ہر نفس ہے صرف فریاد و فغان دلخراش
رو رہی ہے خوں کے آنسو چشم چرخ ہفتمیں

ان شراروں کو کوئی کر دے چمن میں منتشر
تا ہو ہر برگ و شجر آتش بجان و آتشیں

ترجمان راز سبحان الذی اسریٰ ہے یہ
فرشگاہ شہریار گنبد خضرا ہے یہ

استدراک

کیا زمیں کی وسعتیں، کیا اب زمیں کا امتیاز
ہو رہی ہے رفعت چرخ بریں پر ترکتاز

ہوگیا ہے صور اسرافیل اب ہر اک نفس
بن گئی ہے ہر نظر اک شعلۂ آہن گداز

مضطرب ہو جائیں جس سے ساکنان عرش بھی
ہاں ذرا اک بار کوئی نالۂ گردوں نواز

داستان طول ہجراں ہو چکی ہے مختصر
ہو چکا کوتاہ کتنا قصۂ زلف دراز

اب کہاں وہ شوخی حسن گلستاں آفریں
غمزۂ خونریز و عجب و عربدہ، انداز و ناز

شاہد معنی اٹھانے کو ہے اب رخ سے نقاب
کیوں پریشاں ہو کر اب ہونے کو ہے افشائے راز

قربت تیر و کماں سے تابکے آخر گریز
صحبت شمشیر سے کب تک یہ آخر احتراز

سامنے دیکھو صف آرا لشکر ابلیس ہے
یہ بتاؤ کیا سماع و قول کا ہے اب جواز؟

دیکھنی ہے ان کے ہاتھوں میں بھی اب تیغ دودم
کام جن کا ہے فقط تسبیح و تہلیل و نماز

اعتبار گردش ارض و سما کچھ بھی نہیں
زندگی جہد مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

مطبوعات جدیدہ

جامع الشواھد فی دخول غیر المسلم فی المساجد از مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، تقدیم و تدوین از جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۷۶، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ شاہد ۱/۹، علی گڑھ کالونی، کراچی، پاکستان ۷۵۸۰۰۔

اس صدی کی دوسری تیسری دہائیوں میں ترکی کی خلافت اسلامیہ کے تحفظ اور برطانوی استعمار کی شکست کے لیے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کے نظارے عام تھے جامع مسجد دہلی میں سوامی شردھانند کی آمد و تقریر اسی کی ایک جھلک تھی جس سے مسلمانوں کا ایک طبقہ زیادہ خوش نہیں ہوا، نتیجہ میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ غیر مسلموں کا مساجد میں آنا اور وہاں کی مجلسوں میں شریک ہونا جائز بھی ہے یا نہیں، اس سے متاثر ہو کر مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مفصل مضمون میں شرعی دلائل سے اس کا جواز ثابت کیا، اولاً یہ مضمون معارف میں شایع ہوا اور پھر مطبع معارف سے ہی ایک رسالہ کی شکل میں اہتمام سے شایع کیا گیا، بعد میں اس کے طبع جدید کے لیے مولانا مرحوم نے اس میں اصلاح و اضافہ بھی کیا، اب فاضل مرتب نے جو برصغیر میں مولانا آزاد کے آثار و تبرکات کی تدوین و اشاعت کے کام میں بہت سرگرم ہیں، اس نایاب کتاب کو اس شان سے شایع کیا ہے کہ اس میں اصل مطبوعہ نسخہ اور مولانا مرحوم کا اصلاح شدہ نسخہ دونوں یکجا ہو گئے ہیں، ان دونوں کا تقابلی مطالعہ مولانا آزاد مرحوم پر داد تحقیق دینے والوں کے لیے خاص طور پر مفید و دلچسپ ثابت ہوگا،

اس کتاب سے مولانا کی فقہی بصیرت کے علاوہ ان کی نثر نگاری کی دو متضاد کیفیتوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے، ایک طرف توان کا یہ طاقتور اور دلکش اسلوب ہے کہ "اسلام نے اپنے تمام عقائد، اعمال، مکانات اور اجتماعات میں دوسرے مذہبوں کی طرح کوئی راز اور مخفی بات نہیں رکھی، اس کی ساری باتیں دوپہر کے سورج کی کھلی اور چمکیلی ہیں، اس کی عبادت گاہوں میں کوئی بھید نہیں جس کے کھل جانے کا اسے ڈر ہو، دل اور روح کو چھوڑ کر اس نے زمین اور مٹی کی کوئی ایسی پاکی اور ستھرائی نہیں بنائی ہے جو کسی جسم یا اس کے سایے کی چھوت سے ناپاک ہو جائے، وہ ایک بے باک طاقت اور کامل حسن کی طرح سب کو دعوت دیتا ہے کہ آئیں، دیکھیں اور مفتوں ہوں"۔ دوسری جانب ان کا یہ مشہور اسلوب بھی موجود ہے کہ "فی الحقیقت ترک عمل بالکتاب والسنہ ہی کا نتیجہ وہ فتنہ اصلیہ اساسیہ ہے جو آج صدیوں سے ہادم ملت اسلامیہ و محقق بدو غربت اسلام و سبب تفاقم امر و اشتداد باس و مولد مفاسد و مہالک و باعث جمیع نوازل و زلازل و قلاقل قرن بعد قرن و تارۃ بعد اخری ہو رہا ہے"۔ شروع میں فاضل مرتب نے اپنی تحریر میں اس فقہی مسئلہ کو "مسلمانوں کے ایک نہایت غیر شرعی رویہ" سے تعبیر کیا ہے، کتاب میں آیات قرآنی بغیر اعراب کے ہیں، ایک جگہ صاغرون، ساغرون چھپ گیا ہے۔

اقبال اور مغربی مفکرین از جناب پروفیسر جگن ناتھ آزاد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۸، قیمت ۱۸۰ روپے، پتہ: مکتبہ علم و دانش، مزنگ، لاہور پاکستان۔

علامہ اقبال کے محب و پرستار کی حیثیت سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد محتاج تعارف

نہیں، اقبالیات کے موضوع پر ان کی متعدد کتابیں شایع ہوچکی ہیں، جن میں زیر نظر کتاب سب سے اہم اور مقبول ثابت ہوئی، پاکستان میں ۸۰ء سے ۹۴ء تک یہ چار بار طبع ہوئی، فاضل مصنف کے نزدیک فکر اقبال کا زیادہ تر مطالعہ و تجزیہ، اسلامی فکر و فلسفہ کی روشنی میں کیا گیا لیکن ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں دوسرے آفاقی عناصر کی اہمیت کم نہیں، قدیم ہندوستانی فلسفہ، جدید مغربی افکار جس میں مارکس اور اینگلز کا نظام فکر بھی شامل ہے، ان سب کا اثر، کلام اقبال میں واضح ہے، اس گوشہ کو نظر انداز کردینے سے اس کے اکثر حصے کی تفہیم و تعبیر ناقص و نامکمل رہے گی، زیر نظر کتاب اسی احساس کا نتیجہ ہے جس میں فلسفہ یونان و یورپ سے اقبال کے عمومی تاثر کے علاوہ مغرب کے ممتاز فلاسفہ کے خیالات و نظریات کا الگ الگ اور مفصل جائزہ لے کر بتایا گیا ہے کہ دراصل مغربی فلسفہ دنیا کے فلسفے سے جدا نہیں بلکہ انسان کی فکری کاوش کے تسلسل کا ایک حصہ ہے، کلام اقبال میں جابجا اگر اس کا عکس نظر آتا ہے تو یہ اقتباس نور کی فطری خواہش کا نتیجہ ہے۔ فاضل مصنف نے اس بحث کے اختتام پر لکھا کہ "اقبال کے فکر و نظر نے جس فنکارانہ کمال کے ساتھ مشرق و مغرب کے درمیان ایک پل کا کام دیا ہے وہ مشرقی ادب کا متاع گراں مایہ اور لازوال سرمایہ ہے"۔ اس معتدل اور متوازن ترجمانی کے علاوہ اسلوب کی سادگی و سنجیدگی کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔

سکوں پر اشعار از جناب سید نور محمد اکیلوی مرحوم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، خوبصورت جلد، صفحات ۲۶۰، قیمت ۱۷۵ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

مسکوکات قدیمہ کی تلاش اور ان کو جمع کرنے کا شوق دلچسپ مشغلہ ہے لیکن اسے تاریخ و

تحقیق کا موضوع بنانا آسان نہیں، انیسویں صدی کے وسط سے اس پر تحقیقی کام میں تیزی آئی، ہندوستان کے قدیم سکوں پر متعدد کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن اردو میں اس سے بہت کم اعتنا کیا گیا، زیر نظر کتاب نے اس کمی کو جس خوبی سے پورا کیا ہے وہ حد درجہ قابل ستایش ہے، فاضل مولف کو بچپن سے سکے جمع کرنے کا شوق تھا، بعد میں اس نے علمی و تحقیقی شکل اختیار کی چنانچہ انہوں نے لندن یونیورسٹی میں مشہور ماہر مسکوکات ڈاکٹر بیوار کے زیر نگرانی بڑی محنت و جانفشانی سے داد تحقیق دی، یہ کتاب اسی محنت کا ثمرہ ہے، اس میں اولاً سکوں کی تاریخ اور سکے پڑھنے کے فن پر عالمانہ بحث ہے، اس سلسلہ میں مستشرقین کی بعض فاش غلطیوں کی نشاندہی نہایت متانت و اعتماد کے ساتھ کی گئی ہے اور پھر اصل موضوع یعنی سکوں پر اشعار کی تاریخ بڑے سلیقہ و ترتیب کے ساتھ دی ہے، دنیا میں پہلی بار سکوں پر منظوم عبارت نقش کرنے کا امتیاز ہندوستان کے حکمراں سمدرا گپت کو حاصل ہے جس نے سنسکرت زبان کے اشعار درج کرائے تھے، اسی کی تقلید میں خلیفہ ہارون الرشید نے پہلی بار عربی اشعار سکوں پر کندہ کیے، فارسی زبان کے اشعار بھی سکوں پر مضروب ہوئے لیکن حیرت ہے کہ اس باب میں اولیت کا شرف ایرانی حکمرانوں کے بجائے گجرات کے محمد شاہ ثانی کو حاصل ہوا، تحقیق و تاریخ کے ان موتیوں کو فاضل مولف نے بڑی خوبی کے ساتھ پرویا ہے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علاوہ آسام، اندور، پنجاب، ٹونک، جودھ پور اور کشمیر کے راجگان کے بھی ایسے سکوں کا ذکر ہے جن پر فارسی اشعار درج ہیں، ایران و افغانستان کے سکوں کا بھی ذکر ہے، ایک الگ حصہ میں سنسکرت، عربی، فارسی اور اردو کے اشعار نقل کیے گئے ہیں اور بعض سکوں کی صاف

دو واضح تصویروں کا انتخاب بھی ہے، بلاشبہ اپنے موضوع پر اردو زبان کے ذخیرہ میں یہ بیش بہا و بے مثل اضافہ ہے، اس کی اشاعت کے لیے خدا بخش لائبریری پٹنہ اردو دنیا کی جانب سے داد و شکریہ کی مستحق ہے۔

عظمت رازی از جناب ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۷۶، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: اعجاز پبلشنگ ہاؤس ۲۰۶۰، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔

جالینوس عرب ابوبکر محمد بن رازی کا شمار تیسری صدی ہجری کی ان باکمال شخصیات میں ہے جن سے تاریخ اسلام کے دور عروج کے صفحات روشن ہیں، علم طب میں ان کا درجہ اسی سے ظاہر ہے کہ وہ اہل نظر کے نزدیک جالینوس ثانی تھے، عظیم معالج و طبیب کے علاوہ وہ کثیر التصانیف اہل قلم تھے، کتاب الحاوی کے علاوہ فن طب میں انکی متعدد کتابیں ہیں، جن میں کتاب المرشد کا اردو ترجمہ لائق مصنف نے دو سال قبل کیا ہے، حکیم رازی کے تصنیفی سرمایہ سے مستشرقین نے خاص اعتنا و استفادہ کیا، اردو میں یگانہ روزگار کے شایان شان توجہ کم کی گئی، زیر نظر کتاب اسی کمی کی تلافی ہے اور مختصر ہونے کے باوجود اس میں سوانح و کمالات و خدمات کا جامع استقصا کیا گیا ہے، پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں علمی طبی سرمایہ کی بحث خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس میں کتاب الحاوی کے علاوہ حکیم رازی کی دیگر کتابوں کا عمدہ تعارف ہے، نوجوان اور لائق مولف، عالم و طبیب ہیں، عظمت رازی کی داستان سرائی انکو زیب دیتی تھی، انھوں نے اس فریضہ کو بطریق احسن انجام دیا۔

ع۔ ص۔

دار المصنفین کی اہم ادبی کتابیں

شعر العجم حصہ اول: (علامہ شبلی نعمانی) فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا عہد بعہد ترقی اور اس کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور عباس مروزی سے نظامی تک کے تمام شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۳۰ روپے

شعر العجم حصہ دوم: شعرائے متوسطین خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ و ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت ۳۵ روپے

شعر العجم حصہ سوم: شعرائے متاخرین فغانی سے ابو طالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت ۲۵ روپے

شعر العجم حصہ چہارم: ایران کی آب و ہوا، تمدن اور دیگر اسباب کے شاعری پر اثرات و تغیرات دکھانے کے علاوہ تمام انواع شاعری میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ۔ قیمت ۳۵ روپے

شعر العجم حصہ پنجم: قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ۔ قیمت ۳۰ روپے

انتخابات شبلی: شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح، عیب و ہنر، شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۲۵ روپے

کلیات شبلی (اردو): مولانا شبلی کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی قصائد اور تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں شامل ہیں۔ قیمت ۲۵ روپے

گل رعنا: (مولانا عبدالحیٔ مرحوم) اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد اردو شعرا (ولی سے حالی و اکبر تک) کا حال اور آب حیات کی غلطیوں کی تصحیح، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ۔ قیمت ۶۰ روپے

نقوش سلیمانی: مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمات، خطبات اور ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں اردو کے مولد کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت ۶۰ روپے

شعر الہند حصہ اول: (مولانا عبدالسلام ندوی) قدما کے دور سے جدید دور تک اردو شاعری کے تاریخی تغیر و انقلاب کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ

شعر الہند حصہ دوم: (مولانا عبدالسلام ندوی) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید۔ قیمت ۵۰ روپے

اقبال کامل: (مولانا عبدالسلام ندوی) ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح حیات، فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، ان کی اردو و فارسی شاعری کی ادبی خوبیاں اور ان کے اہم موضوعات فلسفہ خودی و بیخودی نظریہ ملت، تعلیم سیاست، صنف لطیف (عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق کی تشریح۔ قیمت ۴۰ روپے

اردو غزل: (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) اردو غزل کی خصوصیات و محاسن اور ابتدا سے موجودہ دور تک کے معروف غزل گو شعرا کی غزلوں کا انتخاب۔ قیمت ۷۵ روپے